

قتلِ شفائی

برگد

غزل، نظم، دوہا، رباعی، خماسی



ہمدرد

غزل، نظم، دوہا، رباعی، خماسی



سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

2004

نسیہ زامد نے

اسین کیو پر نثر، لاہور سے چھپوا کر

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد — ایک ہزار

قیمت ۳۰۰/۰۰ روپے



ISBN - 969 - 35 - 0636 - 7

مرحوم بہن کے نام

جس کے پیار کے برابر کسی بھائی کو
اپنی بہن کا پیار نہ مل سکا ہوگا

بیوی کے نام

جس کا زندگی بھر کا بے نام و نشان
ایشاد، مر کے بھی نہ بھٹا سکوں گا

ترتیب

ابتداءً ۱۵

دعا ۱۷

روشنی اے روشنی ۱۹

جب بھی کتا ہوں کوئی تازہ غزل تیرے لیے ۲۱

تیری راہوں میں بھٹکنے کے لیے زندہ ہوں ۲۳

شعہ ۲۵

راکھ ۲۶

سُورج مرے دل میں جل رہا ہے ۲۷

زخموں کو گلاب بلکہ رہے ہیں ۲۹

بانجھ موسموں کی راگنی ۳۱

دُنیا مری آباد ہے جس راحت جاں سے ۳۳

روشن دہ مرا گوشہ تنہائی ترکر جائے ۳۵

عصبت ۳۷

جھوریت ۳۸

گئے برس جو گیت سنا تھا ہر یلے سارن سے ۳۹

آنسو آنسو ہر قطرہ شبنم کا ہے ۴۱

جو خود اس کا رستہ روکیں ان کے آگے بھٹکتی ہے ۴۳

شناخت ۴۵

سراپا غم ہیں اور وہ لگدانا چاہتا ہے ۴۷

دہ کھل کر اب کوئی جلوہ دکھانا چاہتا ہے ۴۹

ایفرو ایشیائی نغمہ ۵۱

سینے میں حسرتوں کی جن چاہتا نہیں ۵۳

یاد کماں تک اور محبت نبھاؤں میں ۵۵

غبار بیٹھ گیا ۵۷

محبت ہو رہی ہے تازہ دم آہستہ آہستہ ۵۹

ہواؤں کی زبانی سُن لیا ہوگا ستاروں نے ۶۱

دفا کا بوجھ ہے سر پر مگر اُس کا یہ کہنا ہے ۶۳

کو کھ جلی ۶۵

جیسا اُس کے لیے سنا تھا ویسا ہے ۶۷

گزارا ہے بیگانہ بن کر کیسا دہ ۶۹

لے گیا اپنی سب رکھائیں اپنے ساتھ ۷۱

سلسلہ خیالوں کا ۷۳

ٹوٹے گی دیوار ۷۵

اک بار جو تک لے اُسے ملتا ہی چلا جائے ۷۷

بے ذوق تھی یا محسن سے آگاہ تھی پہلے ۷۹

صحراؤں میں اک چھاؤں سی بکھراتی رہے گی ۸۱

دُرواں دقت سے ۸۳

معراج نظر ۸۶

اپنے لبوں کو دشمن اٹھارست بنا ۸۷

رد کا ہے ٹوٹنے جس کو مدد عرض حال سے ۸۹

گریر مسرت ۹۱

آخر وہ میرے قد کی بھی حد سے گزر گیا ۹۳

کھٹا، رزق اور پتھر ۱۲۵
 وہ شخص جس کو مری زندگی میں آنا تھا ۱۲۶
 نہ دلوں سے وہ رہے اور نہ وہ زمانہ رہا ۱۲۹
 اگرچہ بزم میں درد آشنا بھی کتا ہے ۱۳۱
 لفظوں کی بائنی کا سانپ ۱۳۳
 صحت ترے ہاتھوں کو چوموں تیری بیعت چاہوں ۱۳۵
 چاند بھی راہ میں کیا ہے روشن پھر بھی کوئی نہ آیا ۱۳۷
 خون کی دستک ۱۳۹
 زلزلے ۱۴۲
 امیری کے نشان سارے کے سارے بر محل رکھنا ۱۴۳
 اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا ۱۴۵
 ایک انوکھی لڑکی ۱۴۷
 اُس کی زلف کے سائے سائے چلا کرو ۱۴۹
 اس دھرتی کے کشیش ناگ کا ڈنک بڑا زہریلا ہے ۱۵۱
 یوں لگتا ہے لکھنؤ ہماری موم کا پسے ہوئے کفن ہے ۱۵۳
 نیلی روشنیاں ۱۵۵
 دین بے دجود ۱۵۷

کچھ راحتوں کی کھوج میں آئی تھی زندگی ۹۵
 اقراء ۹۷
 ہوا کی لہر کوئی چھو کے میرے یار سے آئی ۹۹
 وہ سادہ جس میں زلفوں کی گٹھا چھائی نہیں ہوتی ۱۰۱
 معجزہ ۱۰۳
 کشش جمال ۱۰۴
 دل لگا بیٹھا ہوں لاہور کے ہنگاموں سے ۱۰۵
 جب کسی جام کو ہونٹوں سے لگایا میں نے ۱۰۷
 جب سے آیا ہے ترے پیار کا موسم جاناں ۱۰۹
 اب اور تب ۱۱۱
 خود فریبی ۱۱۲
 دستِ عوام ہو کر گریبانِ شہر یار ۱۱۴
 جب سے لبوں پہ شہرِ گلہو تاجپے لگا ۱۱۵
 شہر آشوب ۱۱۷
 ہرنے سورج کی رہ رہ کر پذیرائی کریں ۱۱۹
 کون کس کے ہاتھ آیا اور کھلونا ہو گیا ۱۲۱
 اپنی اپنی سوچ کے صحراؤں میں ۱۲۳

کچھ ذی ہنر جو بے ہنر کی طرح جیسے ۱۵۷

افشائیں اک بھلک میں کمائی وہ کر گیا ۱۵۸

روئے نعمت ۱۶۱

تحفظ ۱۶۲

غبارِ رہزرجب پردہ محمل پہ گر تہا ہے ۱۶۳

مزدوری چیز جو مانگو وہی اکثر نہیں دیتا ۱۶۵

کمائی ختم ہوئی ۱۶۷

چمک آتی ہے آنکھوں میں کہیں کپڑے آتے ہیں ۱۷۱

اگر وہ شخص خود چل کر تھارے پاس آیا ہے ۱۷۳

ہوم سیک (HOME SICK) ۱۷۵

جو پل صراط بناتے ہیں رہزور کی جگہ ۱۷۷

غمکش رہ کے بھی آنکھوں سے بات کرتا ہے ۱۷۹

احساب ۱۸۱

منزلِ مقصود ۱۸۲

شوقِ جلوہ ہے مگر ذوقِ نظر نابینا ہے ۱۸۳

کر رہے تھے قریہ قریہ زندگی کی جستجو، میں ادھر ۱۸۵

رُوبرُو وہ ہے عبادت کرنا ہوں ۱۸۷

فلش بیک (FLASH BACK) ۱۸۹

ہاتھیوں کا لشکر ۱۹۲

پیتا ہے غن اپنا حالات کے مگوں میں ۱۹۳

کیا حسین آج ہے مگر قریب جائے کون ۱۹۵

دو عادتیں ۱۹۷

ایک گم ضم فضا کے سوا کچھ نہ تھا میری چپ چاپ حیرانوں کے لیے ۱۹۹

باہر کی چمک بھی کیا کم تھی، پر بہت کچھ اُس کے اندر تھا ۲۰۱

گوئیے میرے شہر کے ۲۰۲

میں خدا سے کیا کہوں؟ ۲۰۳

شرمندہ انھیں اور بھی اے میرے خدا کر ۲۰۵

پھائی ہوئی گھنگھور گھٹا ہے ہرے سر پر ۲۰۶

شانزے ریزے ۲۰۹

روشنی چاہیے صبا کے لیے ۲۱۳

جسم کے جزیرے میں یہ جو دل کی وادی ہے ۲۱۵

بے تعبیر ۲۱۷

اے کاش تھے ایسا اک زخمِ جدائی دوں ۲۱۹

دُنیا کو دکھائی ہے اک شکل خیالوں کی ۲۲۱

چاند، بڑھیا اور پتھر ۲۲۳

دن بھر ستانے کے لیے پڑوں سے چھن کر آگئی ۲۲۵

یہاں ظلم بندوں پر جب ہو رہا تھا وہ کیوں چُپ رہا ۲۲۶

دو پا : ۲۲۹

رباعی : ۲۲۵

نظامی : ۲۴۱

رنگاں : ۲۶۵

○ مولانا صلاح الدین احمد ۲۶۶

○ فیض احمد فیض ۲۶۹

○ سائر لدھیانوی ۲۸۲

○ فکر تنسوی ۲۸۳

○ اکبر لاہوری ۲۸۶

استدائیہ

گھٹا چم چم بستی ہے، تو چڑیا چھپاتی ہے
مگر میں کیا کروں مجھ کو ہنسی دونوں پہ آتی ہے
کہ وہ اک لمحہ موجود کی جھوٹی گواہی پر
کبھی رو کر کبھی ہنس کر
غموں کا بھی خوشی کا بھی یقیں کرتی چلی جائیں

اگر چم چم بستی یہ گھٹا
اور چھپاتی ناچتی چڑیا
اجازت مجھ کو دے سکتیں



تو میں غم اور خوشی کے سارے موسم
اپنے بس میں کر کے دکھلاتا

میں ہر منظر میں

سب اسرار پس منظر کے دکھلاتا
کر میں انساں بھی ہوں

شاعر بھی ہوں

اور سوچتا بھی ہوں

بُجھے تو آنسوؤں سے اور اپنے قہقہوں سے

مشیت کے خلاف اک اسلمہ خانہ بنانا ہے

نہیں آتا کسی کے تابع فرماں مجھے ہونا

میں خود مختار جینا چاہتا ہوں

میں خود مختار مرنا چاہتا ہوں

وَع

اے خدا اک ایسی تو، مجھ کو زندگانی دے
جو مرے ارادوں کو، عمر جاد دانی دے

بات، ابھی یہ کل کی ہے، میں تصاحف کا حاکم
کھوچکا ہوں میں جس کو، پھر وہ حکمرانی دے

آج بھی کھڑا ہوں میں، بچنے کی سرحد پر
تو مری بلوغت کو، شعلہ جواتی دے

چُپ ہوں ایک مدت سے، میری سوچ گڑبگڑ ہے
میری بے نوائی کو، تو ہی کچھ معافی دے

نفرتوں کا مارا ہوں ، عسقم کا استعارہ ہوں
کم سے کم محبت کی ، مجھ کو ترجمانی دے

ہو مقابلہ میرا ، دشمنوں سے کیوں آخر
بد زباں اگر وہ ہیں ، مجھ کو خوش بیانی دے

میں ققیل پہلے ہی ، قحط کا ستایا ہوں
میرے کھیت پیاسے ہیں ، کوئی ان کو پانی دے

روشنی ، اسے روشنی

اسے روشنی ، اسے روشنی
برکوں کی پائل باندھ کر ، اس شہر میں چہم سے اُتر
اسے روشنی ، اسے روشنی
مانا کر لمبی رات ہے ، اک خوف اس کے ساتھ ہے
پر تو اندھیروں سے نہ ڈر
اسے روشنی ، اسے روشنی

مجھ کو خبر دی چاند نے ، تجھ کو یہ دھرتی بھگا گئی
تو آسمانوں سے چلی ، اور میرے گھر تک آگئی
بارے اندھیرے پھٹ گئے
آنکھوں سے پردے ہٹ گئے
جب سے بنی تو ہم سفر
اسے روشنی ، اسے روشنی



گھر کو کھلا رکھنا سدا ، میں نے اُجالوں کے لیے
 تو زندگی کی لہر ہے ، میرے خیالوں کے لیے
 شمعیں جلا اور اک میں
 تارے کھلا اس ناک میں
 جگمگ کریں دیوار و در
 اے روشنی اے روشنی



جب بھی کہتا ہوں کوئی تازہ غزل تیرے لیے
 میرے احساس میں کھلتے ہیں کنول تیرے لیے

جاننا ہوں کہ مراد شبن جاں ہے، پھر بھی
 دل کی ہر بات پہ کرتا ہوں عمل تیرے لیے

دشمنی یوں تو کسی سے بھی نہیں ہے میری
 صرت حالات سے ہے جنگ بدل تیرے لیے

ہر میرے اس شہر میں ، کر دیے چراغاں چار سُو
 ایسا دکھا منظر کوئی ، سب کو ہے جس کی آرزو
 گلیوں کی رونق بن کے آ
 سب راستوں کو جگمگا
 سارے مکانات پر پکھر
 اے روشنی، اے روشنی

آنکھ جھٹ ہے ہری اس کے کنارے آ جا
میں نے بنوایا ہے اک تاج محل تیرے لیے

اپنا گھر غور سے دیکھا ہی نہیں تُو نے ققیل
یہ تو دُنیا میں ہے جنت کا بدل تیرے لیے



تیری راہوں میں بھٹکنے کے لیے زندہ ہوں
میں ازل ہی سے ترے حُسن کا جوئندہ ہوں

تیرے دل کی بھی نہ مل پائی مجھے شہریت
کس سے پوچھوں کہ میں کس ملک کا باشندہ ہوں

بھاگتے تھے تری آنکھوں کے سمندر جن کو
میں اُنہی دُربنوں والوں کا نمائندہ ہوں



دیکھنا ہے تو مجھے ایک نظر دیکھ ہی لے
صبح کا تارا ہوں لیکن ابھی تابندہ ہوں

کسی جڑ سے میں سجایا نہ گیا جو مجھ سے
میں قنیل آج بھی اُس پھول سے شرمندہ ہوں

شعر

جب اُس نے بنایا ہے مجھے بندہ بے دام
وہ خود ہی مرا کاتبِ تقدیر بھی ہوگا
اب ماتھ بٹایا ہے جو اُس نے تو کسی دن
اللہ نے چاہا تو بعزلِ گیر بھی ہوگا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com





سُورج برے دل میں جل رہا ہے
یہ موم کا گھر گھس رہا ہے

اُٹھا تھا دُھواں بس اک نکال سے
اب شر کا شہر جل رہا ہے

یہ شہر جو اب ہے نوحہ نوحہ
پہلے تو عنزل غزل رہا ہے

اُس گھر سے ہوائیں بے خبر ہیں
جس گھر میں چراغ جل رہا ہے

راکھ

تم کر چکے ہو مجھ سے ابھی جس کا تذکرہ
وہ تو کسی حسین پر مرنے کی عمر ہے
ہاں رکھ چکے ہیں جس میں قدم اب تم ادھر ہیں
یہ عمر سارے شہر سے ڈرنے کی عمر ہے

اس دُھوپ میں یہ بھی ہے غنیمت
سایا ہرے ساتھ چل رہا ہے

بن جائے نہ ایک روز اس سدن
بھ پڑ جو پھول پھل رہا ہے

کیچڑ میں تو پل رہی ہے دُنب
اور پاؤں ہرا پھسل رہا ہے

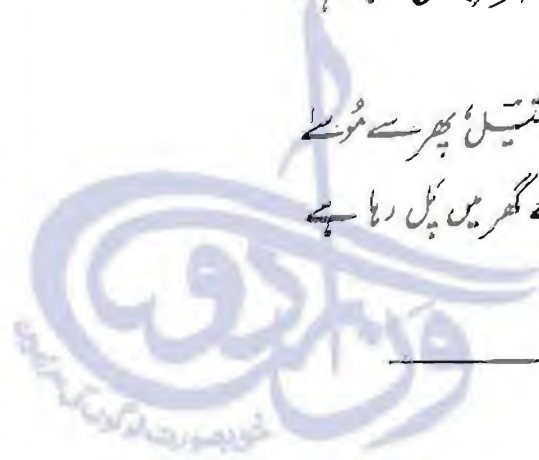
سُنتے ہیں قنصل پھر سے مونس
فرعون کے گھر میں پل رہا ہے



زخموں کو گلاب لکھ رہے ہیں
جیسے کوئی خواب لکھ رہے ہیں

پانی کو بن کے روشنیائی
شعلوں کا جواب لکھ رہے ہیں

ہم اپنی خوشی سے اپنے تن پر
موسم کا عذاب لکھ رہے ہیں



وہ سامنے رکھ کے چمکتا کاغذ
بارش کا حساب رکھ رہے ہیں

پڑھتے ہیں قتیّل ہم تو چہرے
اور آپ کتاب رکھ رہے ہیں

بانچھ موسموں کی راگنی

سنت بھی نہیں کہ حرف رنگ لوں
پیٹے پیٹے رنگ میں
بہار بھی نہیں کہ پھول ٹانگ لوں
کسی نئی اُمنگ میں
خزاں بھی وہ نہیں کہ خشک پتیاں
اوس میں بھگو سکوں
سماں بھی وہ نہیں کہ جس کی تلخیاں
سُرور میں ڈبو سکوں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



گنگ اپنے ساز کی
ایک ایک جھانجھ ہے
کس طرح بشارتوں کا ہو جنم
جب دہن ہی موسموں کی بانجھ ہے



دُنیا مری آباد ہے جس راحتِ جاں سے
دیتا ہوں دُعاؤں اُسے دھڑکن کی زباں سے

ہجرت سے دفائیں مرا منہ دیکھ رہی ہیں
شیشے کا خریدار ہوں پتھر کی دُکاں سے

ایسا وہ کس جیسا غزل میں نظر آئے
سب ٹھن ہے اس کا مرے اندازِ بیاں سے

تم ہاتھوں کو بیکار کی زحمت سے بچا لو
دشک کا جواب آتا نہیں خالی مکاں سے

رکھے جو ققیل اپنے سمندر کو بچ کر
شکوہ ہے مری پیاس کو اُس پیر مغاں سے



روشن وہ برا گوشہ تنہائی تو کر جائے
یادوں میں سسی، انجمن آرائی تو کر جائے

یہ میری ضمانت ہے کہ پائے گا وہ شہرت
تھوڑی سی وہ پہلے مری رسوائی تو کر جائے

کردوں میں اُسے عقل کے مفہوم سے واقف
کچھ دن کے لیے وہ مجھے سودائی تو کر جائے

سب کہتے رہیں میں اُسے قاتل نہ کہوں گا
لیکن وہ کوئی کارِ مسیحائی تو کر جائے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



میں دیکھ سکوں چہروں کے پیچھے بھی ہے کیا کچھ
اسی سی عطف وہ مجھے بینائی تو کر جائے

میں کر تو سکوں مجرم محبت کی وضاحت
پھر جو وہ سزا دے، مری شنوائی تو کر جائے

ہے فرمن ققیل اُس پہ مرا جان چھڑکنا
پردہ مری کچھ سو سدا افزائی تو کر جائے

عصمت

بکھری پڑی تھیں زمیں پر کچھ آوازیں
میری سماعت نے جن کو سمیٹا
اُن میں اک آواز تھی ایسے کاہن کی
جو تمکنت سے خلا میں تھا لیٹا
میں کون ہوں کیا ہوں؟ پوچھا نہ یہ اُس نے
مجھ کو بس اک رٹ میں اُس نے لیٹا
تجھ میں رواں ہے لہو کس قبیلے کا
تو جس کا بیٹا ہے وہ کس کا بیٹا؟



گئے برس جو گیت سُنا تھا ہر ایسے ساون سے
وہی گیت میں سُنا چاہوں آج تری جھانجھن سے

پُورے چاند کی رات کو جب تُو میرے پاس نہیں تھی
اگنی بان برستے دیکھے میں نے کرن کرن سے

تیرے حوالے میں نہیں کرتا اس لیے دل اپنا
تجھ کھلوتے توڑنے کی عادت سی ہے بچپن سے

یہ سب جادو ہے ایسی تیرے ساٹو لے پن کا
آتی ہے چندن کی خوشبو تیرے مست بدن سے

جمہوریت

کہتے ہیں جس کو جذبہ جمہوریت ، وہ پیڑ
تا زندگی کسی سے اکھاڑا نہ جائے گا
جس کی جڑیں عوام کے ذہنوں میں ہوں قسب
وہ باغ آندھیوں سے اُجاڑا نہ جائے گا

کاہے چُپ چُپ کر بیٹھ تو میری کوتاہی میں
وہ سبھی کیا سمجھتی، جس کو آئے لاج بہن سے

ایسی بات نہ اب پھڑوں گا جو ایسی دلی ہو
پہلے ہی میں تجھے مٹا کر لایا لاکھ جتن سے

لاکھ قاتل کسے جاؤ تم اک پتے پریمی ہو
آدمی تو پہچانا جائے اپنے چال چلن سے



آنسو آنسو ہر قطرہ شبِ بنم کا ہے
یہ منظر، یہ گرہ کس موسم کا ہے

پس منظر میں شور ہے کچھ زنجیروں کا
سانے دھوکا پائل کی جھم جھم کا ہے

کچھ گونگوں نے چھڑنے گیت اُجالوں کے
اندھوں کی بستی پر سورج چمکا ہے

میں نے دیا الزام تو پیچ اٹھا شیطان
یار، یہ سارا کیا دھسرا آدم کا ہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



باندھے وہ دستار جو سر بھی رکھتا ہو
قول یہ میرے اک بچے ہمدم کا ہے

پتھر جس کو سب کہتے ہیں یار قتیل
پہلا نام وہ ایک حسین صنم کا ہے



جو خود اس کا رستہ روکیں اُن کے آگے ٹھکتی ہے
ورنہ ہر دروازے پر تفتیر بھلا کب رکتی ہے

میری گلی کے ٹٹنے والے شور مچاتے ہیں لیکن
تب امداد پہنچتی ہے جب بربادی ہو چکتی ہے

ساؤن تو ہے ایک مگر کیا کیسے اس دو رنگی کو
باہر پڑے پھوار تو اندر جان ہماری ٹھکتی ہے



کبھی نہ دیکھی کسی نے اب تک نرمی بانجھ درختوں میں
جس ڈالی پر پھل آجائے صرف وہ ڈالی ٹھکتی ہے

ایک ہی وہ بازار تھا جس میں یوسف بیچا گیا قنصل
اپنے ہر بازار میں اب انسان کی قیمت ٹھکتی ہے

شناخت

میں نے اک شعر سنا
رُوح مری جھوم گئی
دل میں کھنک پیدا ہوئی
سوچ نے اگڑائی لی

میں نے اس شعر کے خالق سے کہا:
اپنی تخلیق مرے سایہ تحسین ہنر تک لے آ
تاکہ میں بھی تری اس پرورش لوح و قلم کے انداز
غور سے دیکھ سکوں



دیکھ کے اُوروں سے کموں
 آج میں نے بھی وہ آواز سُنی ہے جس میں
 اک چپکتے ہوئے غنچے کی ادا شامل ہے
 اک چپکتے ہوئے پنچھی کی صدا شامل ہے
 اک اُڈتے ہوئے بادل کی دُعا شامل ہے
 — اور اس شعر کے خالق نے کہا: —

اے ہرے قدر شناس
 ساری دُنیا سے الگ یہ تری تحسین ہنر!
 تُو کوئی صاحبِ اولاد نظر آتا ہے



سراپا غم میں اور وہ گدگدانا چاہتا ہے
 زبردستی کوئی ہم کو ہٹانا چاہتا ہے

وہ رہبر، بھائی ہے جو ایک بھری جانور کا
 ہماری لاکش پر آنسو بہانا چاہتا ہے

کیا ہے جس نے پتھر اوُٹھا کا نام لے کر
 وہ دُنیا میں کوئی نیکی کمانا چاہتا ہے



بہت زوروں پہ ہے دونوں طرف شوقِ شہادت
بے دیکھو وہی جنت میں جانا چاہتا ہے

کہو سب شہر والوں سے کہ اُس کے ساتھ ہو لیں
قتیلِ انسانیت کا گیت گانا چاہتا ہے



وہ کھل کر اب کوئی جلوہ دکھانا چاہتا ہے
وہ کہتا ہے ”اُسے سارا زمانہ چاہتا ہے“

خدا شاہد، بُری نیت نہیں رکھتا وہ قاتل
تماشاِ قصِ بے عمل کا دکھانا چاہتا ہے

وہ زخمِ آئیں گے جن کے ساتھ اک مرہم بھی ہوگا
نئے تیروں سے وہ ترکش سبانا چاہتا ہے



یہ کہہ کر ایک نیا پنجرہ بنا دیتا ہے صیاد
پرنده خود ، قفس کا آب و دانہ چاہتا ہے

قتیل اُس کو ہماری بے گناہی سے غرض کیا
سزا دینے کا وہ کوئی بہانہ چاہتا ہے

ایفروایشیائی نغمہ

زنجیریں جب ٹوٹیں گی جھنکار تو ہوگی
صدیوں کی سوئی دُنیا بیدار تو ہوگی

پھیلے ہوئے اس دھرتی پر ہیں لوگ جہاں تک
پہنچے گی زنجیروں کی جھنکار وہاں تک
دُنیا جاگی تو کوئی محکوم نہ ہوگا
کوئی وطن آزادی سے محروم نہ ہوگا
چکنا چور عسلاہی کی دیوار تو ہوگی
صدیوں کی سوئی دُنیا بیدار تو ہوگی



دُنیسا بھر کے انسانوں کا یہی ہے کمنٹ
 سب کا حق ہے امن اور چین سے زندہ رہنا
 پاس نہ آنے دو نفرت کے طوفانوں کو
 پیار کی آج ضرورت ہے سب انسانوں کو
 پیار کی مٹی سے پیدا ہوگا تو ہوگی
 صدیوں کی سوئی دُنیسا بیدار تو ہوگی



سینے میں حسرتوں کی جہن چاہتا نہیں
 غم اب کوئی نیا مرا من چاہتا نہیں

وہ میرے شہر دل میں اگر آبا تو کب
 وہ کون ہے جو اپنا وطن چاہتا نہیں

اتنا تھا وہ غموں نے فرشتہ بنا دیا
 اب وہ تعلقاتِ بدن چاہتا نہیں

کہتے ہیں اُس کے حال پہ روتے ہیں دیوتا
 جس سانپوری کو اُس کا سجن چاہتا نہیں

امن کے بادلِ راک دن ہر سو چھائے ہیں گے
 دھوپ کے بدلے ٹھنڈے ٹھنڈے سائے ہیں گے
 پورب پچھم ہوگی آزادی کی رم بھم
 روکے گی جو قوم اسے کھلانے کی مجرم
 پت بھڑ میں بھی یہ دھرتی گلزار تو ہوگی
 صدیوں کی سوئی دُنیسا بیدار تو ہوگی

ہونا ہو جس کو دفن خود اپنے ہی صبر میں
وہ چہرہ آنسوؤں کا کفن چاہت نہیں

اُس کو نہ پا کے جو اُسے رُسا کریں قسّیں
میں ایسے ظالموں کا چلن چاہت نہیں



یارو، کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مجھ کو بددیں کر اُسے بھول جاؤں میں

دل تو جلا گیا ہے وہ شعلہ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں

مُنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
انے زندگی خوشی سے کہیں سر نہ جاؤں میں

اک شب بھی وصل کی نہ ہر ساتھ دے سکی
عمرِ فراق آ کر تجھے آ زماؤں میں



بدنام میرے قتل سے تنہا تو ہی نہ ہو
لا اپنی ٹہر بھی سرِ محض لگاؤں میں

اُترا ہے بام سے کوئی اسم کی طرح
جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں

اُس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
ہنس کر اُسے قتل گئے سے لگاؤں میں

غبارِ بٹیمھ گیا

اپنے ماضی کے ناراض لمحات سے
یہ مری آج کی گفتگو —
دل پہ رکھی ہوئی اک گراں بارسل توڑ کر
اور بھی کچھ مجھے مُنفعِل کر گئی
وہ جو کچھ روح میں ہلکے ہلکے سے گرداب تھے
اُن کو بھی وہ برے غم کے تالاب میں منتقل کر گئی

اور پھر اتنے اُن دیکھے آنسو بہائے مری آنکھ سے
 تر بہ تر دامن جانِ دہلی کر گئی
 لیکن اتنا ہوا
 شدتِ درد کو
 آج کی گفتگو معتدل کر گئی —



بجست ہو رہی ہے تازہ دم آہستہ آہستہ
 بڑھائیں آپ بھی آگے قدم آہستہ آہستہ

تھکے پاؤں بھی ہم تیرے شبستاں کے مسافر ہیں
 پہنچ ہی جائیں گے منزل پر ہم آہستہ آہستہ

ترا بس تو کیا، پیغام ہی نے کر دیا ثابت
 خوشی آئے تو مٹ جاتے ہیں غم آہستہ آہستہ

خود اُن کو ہم نے اپنے کعبہ دل میں بسایا تھا
 اب اس کعبے سے نکلیں گے صنم آہستہ آہستہ



ابھی تو وہ ہمارے شہرِ دل کے خاص مہمان ہیں
کھلے گا خُسنِ دالوں کا مہبم آہستہ آہستہ

بہت کم آس رکھنی چاہیے شادابیِ دل کی
برستا ہے یہاں ابرِ کرم آہستہ آہستہ

قتیلِ انجم ہوتا کاش اپنا عاشقوں جیسا
کر دم دیتے کسی زانو پہ ہم آہستہ آہستہ



ہواؤں کی زبانی سُن لیا ہو گا ستاروں نے
سندلیہ جو تجھے بھیجا ترے فرقت کے ماروں نے

وہ آنکھیں جو وضاحت کے سبھی انداز رکھتی تھیں
یہ کیا ابہام پیدا کر دیا ان کے اشاروں نے

کما رک تجرے نے، دیکھ یہ ہوتی ہے مجبوری
گلے سے پتھروں کو جب لگایا آفتابوں نے

پہننے کو دیا آخر لبِ اوہ خشک پتوں کا
خزاں کو ایک سوتیلی بہن سمجھا بہاروں نے



نظر آیا ہر اک تصویر میں وہ آشنا چہرہ
رُلا ڈالا مصوّر ہم کو تیرے شاہکاروں نے

خُدا جس کی زباں سے بولتا تھا، وہ چڑھا سولی
یہ نظارہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہزاروں نے

وہ دیتا ہے قلیل اور بے خوشا مدُجھ کو دیتا ہے
خُدا میرا نہیں دیکھا ترے پروردگاروں نے



وفا کا بوجھ ہے سر پر، مگر اُس کا یہ کہنا ہے
کہ یہ پتھر گھیل جانے تک اُس کو زندہ رہنا ہے

وہ پر بت کا اک ایسا پیڑ ہے جس نے زمیں میں
بدن کے ڈھانپنے کو برف کا ملبوس پہنا ہے

وہ اک سایا جو تحفے میں دیا تھا اُس کو خوابوں نے
وہی اب اُس کا آئینہ ہے وہی اب اُس کا گناہ ہے

لکھا تھا ریت پر اک دوسرے کا نام کیوں ہم نے
نیچے میں جو صدمہ ہے وہ ہم دونوں کو کہتا ہے

رہیں گے سب یہاں جھوٹی خوشی پہنے ہوئے، ورنہ
قریب آکر جسے دیکھو وہ اندر سے برہنہ ہے

قتیل ایسی بھی اک عورت ہے اس رشتوں کی تہیں
کہ جو ماں ہے نہ بیٹی ہے نہ بیوی ہے نہ بہنا ہے

کوکھ چلی

(عامسی رمزی مرحوم کی مختصر پنجابی نظم کا پھیلاؤ)

گاؤں سے باہر،
ٹیلے والی، اک درویش کی قبر کے اوپر
آدھی رات کو
بھلے کپڑے، جگمگ زلیور پہنے ہوئے
وہ کون تھی دیا بھلانے والی
سب کچھ ہوتے جانے وہ کیا مانگ رہی تھی
رنگ رہی تھی کیوں اُجلا دو شالا اپنا کیسر میں
بمٹو بٹر کیوں چاند کی جانب دیکھ رہی تھی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



تکیہ اپنی چھاتی پر وہ کیوں رکھتی تھی
 انگ وہ پٹوں کی اک سیج بچاتی کیوں تھی
 سیج پر لیٹی کُسنی کے بل
 اپنے آپ سے کیوں وہ باتیں کرتی تھی
 اور پھر باتوں باتوں میں
 وہ برہم کیوں ہو جاتی تھی
 سب کچھ ہوتے چاہتی کیا تھی
 جھلمل کپڑوں، جگمگ زیوروں والی
 اک درویش کی قبر کے اُوپر
 دُئیے جلانے جاتی کیوں تھی؟



جیسا اس کے لیے سُنا تھا ویسا ہے
 میں نے برسوں بعد اُسے اب دیکھا ہے

ہر منظر کا ہوتا ہے اک پس منظر
 وہ لاکھوں میں ایک ہے لیکن تنہا ہے

میں دریا بن جاؤں بھی تو کیا حاصل
 وہ ہے سمندر اور صدیوں کا پیاسا ہے

گیا تھا جب وہ اُس دن اُگ بگولا تھا
 واپس آیا ہے تو برف کا پُتلا ہے



پھر ماضی کو چوما اس کے ہنٹوں نے
پھر اک لفظ مرے کانوں میں رويا ہے

میلہ لگا ہے چار طرف سناٹوں کا
کہیں کہیں کوئی سایا بسکی لیتا ہے

کانچ کا ہر جذبہ پیچھے ہم چھوڑ آئے
اب تو اپنا بچی عمر کا رشتہ ہے

مجھ کو اپنے حال پر آئے رحمِ قہر سیلی
میں نے اک بچھی کو اڑتے دیکھا ہے



گُڑا ہے بیگانہ بن کر کیسا وہ
کبھی نہیں تھا آج سے پہلے ایسا وہ

اندر اندر ٹوٹا سا اک پیمانہ
باہر باہر لال گلابی مے سا وہ

میں نے جھانکے دیکھا اس کی آنکھوں میں
ود لگتا ہے جیسا نہیں تھا ویسا وہ

چوٹ لگی ہے شاید اُس کے بھی دل پر
آج دکھائی دیتا ہے مجھ جیسا وہ

میرا اور اصول ہے اُس کا اور قیقل
پیار ہی پیار ہوں میں پیسہ ہی پیسہ وہ



لے گیا اپنی سب رکھائیں اپنے ساتھ
دروازے پر دستک دینے والا ہاتھ

آپ سنبھل جائے گا ٹھوکر کھانے پر
دل کو میں سمجھاؤں میری کیا اوقات

یاد نہ وہ آئے تو آنکھیں کیا برسیں
جب چھائے گا بادل تب ہوگی برسات

صرف لکھے تھے جتنے وہ سب پھیل گئے
کاغذ کے دشمن ہوتے ہیں گیلے ہاتھ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



مستقبل تو مستقبل ہی رہتا ہے
یوں لگتا ہے کبھی نہ بدلیں گے حالات

تھا مجھ پر بھی تنگ مرا گھر اس پر بھی
تنہائی نے رہن چا ہا میرے ساتھ

میں نے تو دو چار الزام خریدے تھے
دل کے شر سے تم کیا لائے ہو سوغات

ساری رات مسلسل جاگتے والے نے
آنکھوں میں کچھ خواب سجائے کھلی رات

یہ قصہ اپنی تاریخ کا حصہ ہے
کھا گئے ہاتھی چند اہلیوں سے مات

بانگے سے گرے قفسِ محبت بھی
ایک طرح سے ہوتی ہے وہ بھی خیرات

سلسلہ خیالوں کا

جن کے تینکے تک مجھ کو پہچانتے ہیں
یاد مجھے وہ تیری گلیاں آج بھی ہیں
جن کو حاصل رہا سدا رتجگا کوئی
میرے ذہن میں وہ رنگ ریاں آج بھی ہیں
آج بھی میں سوچوں تو ایسا لگتا ہے
ہونٹ ترے مصری کی ڈلیاں آج بھی ہیں

بھڑکاتی ہے جس کو یاد جوانی کی
دیر تلک وہ شعبہ سرد نہیں ہوتا
موسم کیسا بھی ہو خون چمکتا ہے
عمر کوئی ہو چہرہ زرد نہیں ہوتا
یاد نہ رکھے جو امتداد و فائز کے
وہ سب کچھ ہوتا ہے مرد نہیں ہوتا

عمر کے جس رستے پر میں نے پاؤں بھرے
میرے جسم کے ساتھ چلا ہے جسم ترا
پکڑے رہا میں وقت کی انگلی جہاں تلک
پل پل مجھ پر پھایا رہا طلسم ترا
رستہ روکیں جب حالات کے اندھیار
روشنیاں دیتا ہے مجھ کو اکسم ترا

جب میں پیتے وقت کی باتیں کرتا ہوں
کچھ مر جھائے پھول ممکنے لگتے ہیں
کہوں ترے پس منظر میں جب کوئی غزل
بہت پرانے حب ام کھنکنے لگتے ہیں
اب بھی گنتا ہوں جب نام رقیبوں کے
لوگ مجھے حیرت سے تکتے لگتے ہیں

چومتا ہوں میں اُن پیروں کو سپینوں میں
جن پیروں میں روشنیوں کی جھانپن ہے
رات کو اکثر آنکھیں ڈھانپ کے سوتا ہوں
جلگ جلگ یوں بھی میرا قن ہے
کیا لینا مجھ کو ان چاند ستاروں سے
میرے اندر تو اک سورج روشن ہے

ٹوٹے گی دیوار

کچھ روز سے زنداں نظر آتی ہے یہ دُنا
اب کچھ تو یہاں اہل نظر ہو کے رہے گا
انسان سمٹتا ہی چلا جائے کہاں تک
لگتا ہے کہ دیوار میں در ہو کے رہے گا



راک بار جو تک لے اُسے تکتا ہی چلا جائے
شعلہ سا بدن اُس کا دکھتا ہی چلا جائے

کردار ادا جب میں کروں یا دوسب کا
وہ پھول کی مانند نہکتا ہی چلا جائے

حالات کی بجلی نے کیب راگھ نشین
پر آکس کا پنچھی کر چکتا ہی چلا جائے

آجائیں میسر جسے آنکھوں کے وہ ساغر
وہ رند تو پی پی کے بکتا ہی چلا جائے

پھولوں کی توقع ہے نہ امکان ثمر کا
اک پیڑ مگر پھر بھی لکت ہی چلا جائے

ہم لاکھ مہذب ہوں مگر تم ہی ستاؤ
جب ضبط کا پیمانہ چھلکتا ہی چلا جائے

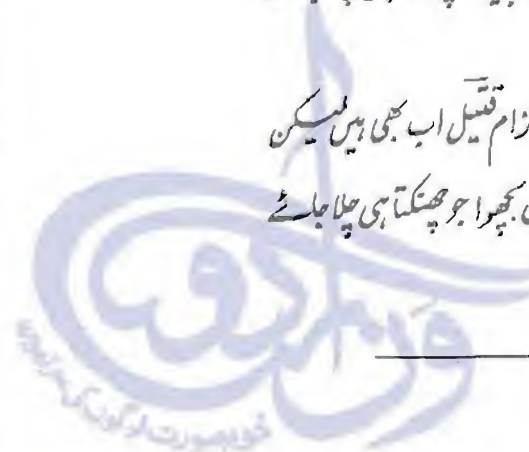
ہر گام پہ الزام قلیل اب بھی ہیں لیکن
اُن پاؤں میں بچھو جو چھلکتا ہی چلا جائے



بے ذوق تھی یا حُسن سے آگاہ تھی پہلے
کیسی تری دُنیا برے اللہ تھی پہلے

میں نے تو سنا ہے کہ یہ دُنیا تری یا رب!
شاعر کے خیالوں کی گزر گاہ تھی پہلے

کرنے کو ہے انسان خلاؤں کو بھی آباد
جو آج حقیقت ہے وہ افواہ تھی پہلے



اب واعظ و ناصح جہاں کرتے ہیں عبادت
کہتے ہیں وہ اک رند کی درگاہ تھی پہلے

پھینا ہے مرا جام اُن آنکھوں نے ، وگرنہ
اس چیز سے بچنے کی کہاں راہ تھی پہلے

تھا رشک رقیبوں کو برے حسن نظر پر
اک حُسن کی دیوی برے ہمراہ تھی پہلے

نزدیک سے دیکھا ہے قتل اب کے گھر اپنا
جنت کی برے دل میں بہت چاہ تھی پہلے



صحراؤں میں اک چھاؤں سی بکھراتی رہے گی
رُت کوئی بھی ہو، زُلف وہ لہراتی رہے گی

تم چھین تو لو گے برے سادن کی گھٹائیں
آواز پیسے کی مگر آتی رہے گی

جاتا رہا خوابوں میں غل ڈالنے والا
اب دن میں بھی اکثر تمہیں نیند آتی رہے گی

بغضتے گی نہ اس کو کوئی سُورج کی عدالت
یہ رات ستاروں کی قسم کھاتی رہے گی

کچھ ضبط نہ کر پائیں گے عشاق بھی تیرے
کچھ صورتِ حالات بھی جذباتی رہے گی

صحر اکو نہ پھوڑے گا کبھی شہر کی خاطر
دُنیا ترے دیوانے کو سمجھاتی رہے گی

تجھ پر بھی قتلِ آن پڑی جب کوئی اُفتاد
سب زندہ دلی یار تری جاتی رہے گی

ڈرو اُس وقت سے

ڈرو اُس وقت سے

اے شاعر، اے نغمہ خوانو، اے صنم سازو

اچانک جب تمھاری سمت

کچھ صدیوں پرانے شیشِ محلوں سے

سُنا سن ریر برسیں گے

بہت چلاؤ گے تم

ڈرو اُس وقت سے
اے شاعر، اے نغمہ خوانو، اے صنم سازو،
جو ممکن ہو تو بڑھ کر روک لو
اُس آنے والے وقت کا رستہ

اور پکارو گے بہت باذوق دُنیا کو
مگر باذوق دُنیا کا ہر اک باشندہ
پہلے ہی سے گھائل ہو چکا ہوگا
جو باقی لوگ ہوں گے
وہ تمہارا ساتھ کب دیں گے
کہ وہ تو رجعتوں کی ہیر دُن پینے کے عادی ہو چکے ہوں گے
انہیں تو صرف وہ باتیں بھلی معلوم ہوں گی
بہالت کا اندھیرا اور بھی ان کی رگوں میں جن سے بھر جائے
وہ باتیں —
عقل و استدلال کا اک شاہِ جن میں نہیں ہوتا
یہ مانا تم بہت سمجھاؤ گے اُن کو
مگر کوئی نہ سمجھے گا
اور اس دورِ سیاہی میں
جو برپا کر بلا ہوگی
وہاں کوئی بھی حُر پیدا نہیں ہوگا تمہاری پاسداری کو
میں گے سب تمہارے خون کے پیاسے



اپنے لبوں کو دشمنِ اظہارِ مت بنا
پتے ہیں جو اُنہی کو گنہگارِ مت بنا

دل کو دبا دبا کے نہ رکھ دھڑکنوں تلے
بے چینیوں کے لطف کو آزارِ مت بنا

جتنے بھی لفظ ہیں وہ مہکتے گلاب ہیں
بجے کے فرق سے اُنھیں تلوارِ مت بنا

ترکِ دم کا جرم نہ مانے گا تُو نہ میں
اس مسئلے کو باعثِ تکرارِ مت بنا

مہراجِ نظر

یاد آئے خالقِ حُسن و جمال
کوئی چہرہ خوبصورت دیکھ کر
زندگی سونا دکھائی دے نہیں
صرف اک مٹی کی مورت دیکھ کر



روکا ہے تُو نے جس کو سدا عرضِ حال سے
ہجرت وہ کر گیا ترے شہر وصال سے

وہ مر گیا جب اس کی سکونت بدل گئی
جیون سے بڑھ کے پیار تھا پنچھی کو ڈال سے

بندھوا رہا تھا جو مرے پاؤں میں بجلیاں
آگے بڑھانہ خود وہ حدِ اعتدال سے

تمہی ایسی بے خودی کہ جب آیا وہ سامنے
مفہومِ گر گیا مرے دستِ سوال سے

الزام کچھ تو گردشِ ایام کو بھی دے
اپنے ہر ایک غم کو غمِ یارِ مست بنا

آ میرے بازوؤں میں کہ ساحل پہ جا لگیں
اس موجِ موجِ دقت کو منہ دارِ مست بنا

تیرا یہ ضبط ، اور وہ شعلہ سا آدمی
سورج کے آگے موم کی دیوارِ مست بنا

شاید وہ تیرے مُنہ پہ ہی سچ بولنے لگے
چہرے کو آئینے کا پرستارِ مست بنا

ہر ایک کے لیے نہ کھلا رکھ اسے قیاس
یہ دل ہے ایک گھر اسے بازارِ مست بنا

تھائیں بھی حکمران کبھی اقلیمِ حسن پر
کچھ لے سبقِ رقیب مرے ہی زوال سے

برسوں چلے قلیلِ زمانے کے ساتھ ہم
واقعہ ہوئے نہ پھر بھی زمانے کی چال سے

گر یہ مسرت

احباب سے چھپ چھپ کے بھی رویا ہوں میں اکثر
پر آج بھری بزم میں
رونے کا مزا اور ہی کچھ ہے

احباب کو حیرت، کہ مرے قہقہہ بردار لبوں پر
کیوں لے گئیں سبقتِ مری بھیگی ہوئی پلکیں —
مرے تپتے ہوئے آنسو

شاید مرے احباب کو معلوم نہیں ہے
اظہارِ مسرت کبھی ہوتا ہے جو رو کر
سوار کا ہنسا بھی اُسے چھو نہیں سکتا

آنسو ہیں وہ موتی
 پلوں کے صدف سے جو نکلے ہیں اُسی دم
 جب دل کے سمندر میں
 خوشی کا کوئی طوفان بپا ہو
 طوفان سما سکتا نہیں صرت ہنسی میں
 آنسو ہی اُسے اپنی تراوٹ میں سیٹھیں تو سیٹھیں
 آنسو کہ جسامت میں ہیں قطرے سے بھی کچھ کم
 اظہارِ مسرت میں سمندر سے بڑے ہیں



آخر وہ میرے قد کی بھی حد سے گزر گیا
 کل شام میں تو اپنے ہی سائے سے ڈر گیا
 مٹھی میں بند کیا ہوا بچوں کے کھیل میں
 جگنو کے ساتھ اُس کا اُجلا بھی مر گیا
 کچھ ہی برس کے بعد تو اُس سے ملا تھا میں
 دیکھا جو میرا عکس تو آئینہ ڈر گیا

بلے جس مرے اجاب ہیں
 کاش اُن کو بتائے کوئی ہمد
 حاصل جو خوشی آج ہوئی ہے مرے دل کو
 شاید وہ تبسم میں سیٹی ہی نہ جاتی
 ہونٹوں پہ تبسم بھی بہت خوب ہے لیکن
 آنکھوں میں ترشح کی فضا اور ہی کچھ ہے
 برسات میں رم بھم کی صدا اور ہی کچھ ہے
 اس بزم میں رونے کا مزا اور ہی کچھ ہے

ایسا نہیں کہ غم نے بڑھالی ہو اپنی عمر
ہوسم خوشی کا وقت سے پہلے گزر گیا

لکھنا مرے مزار کے کتبے پہ یہ حروف
مرحوم زندگی کی حراست میں مر گیا



کچھ راحتوں کی کھوج میں آئی تھی زندگی
دیکھا تو راک لحد میں سمائی تھی زندگی

کیا کیا نہ ایک شخص نے رکھی سنبھال کر
معلوم اب ہوا کہ پرانی تھی زندگی

ہو جائے ریزہ ریزہ لگے جب ذرا سی ٹھیس
کیا سوچ کر خدا نے بنائی تھی زندگی

تھا دشمنوں کے واسطے عبرت کا یہ مقام
کاندھے پہ دوستوں نے اٹھائی تھی زندگی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



اقراء

پیمبر سے کہا جبریل نے:

اقراء

پیمبر نے کہا:

میں پڑھ نہیں سکتا

مگر اُس لمحہ نور و تجلی کا نتیجہ تھا

کہ ایک اُچی وہ عالم بن گیا

دوڑے زمیں پر جن سے بڑھ کر

کوئی بھی علم و بصیرت کا نہ مالک تھا۔

یہیں تک ختم ہو جاتا نہیں یہ سلسلہ علم و بصیرت کا

پیمبر کے غلاموں تک نے پائی روشنی

علم و بصیرت کی

اُجالا ہو گیا مشرق سے مغرب تک

واپس گئی عدم کی طرف خاک اور ڈھ کر
سانسیں پہن کے دہریں آئی تھی زندگی

اُڑتا ہوا وہ ایک پرندہ ہے اب کہاں
اپنے پروں پہ جس نے سبائی تھی زندگی

دیکھا تھا رخسارِ ہستی میں جب تقیل
داؤ پہ ہر بشر نے لگا ئی تھی زندگی

(ڈاکٹر یوسف کی رحلت پر)

کما میرے زمانے سے گزرتے وقت نے

اقراء

کما میرے زمانے نے

مجھے پڑھنا تو آتا ہے

مگر میں بھول جانا چاہتا ہوں سارے لفظوں کو

اور ان لفظوں میں پوشیدہ ہر ایک علم و بصیرت کو

کتا میں غرق دریا کر کے اطمینان و راحت چاہتا ہوں میں

کہ اب ایسا ہی کرنا چاہیے مجھ کو

گزر تے وقت نے پوچھا بھلا کیوں؟

کما — علم و بصیرت اور کتب خانے مرے کس کام کے

جب ہر چر اس ہے پر

بند آواز لاؤد اسپیکروں سے وہ بھی کچھ نشر ہوتا ہے

نفی ہوتی چلی جاتی ہے جس سے دم بدم علم و بصیرت کی

— پھر اس کے ساتھ، سچی بات تو یہ ہے

نہ میں کوئی پیسہ ہوں، نہ تو کوئی فرشتہ ہے

میں تیری بات کیوں مانوں — ؟



ہوا کی لہر کوئی چھو کے میرے یاد سے آئی

کوئی تازہ خبر یوں بھی سمندر پار سے آئی

ہوں سے کم اور آنکھوں سے بہت کرتا ہے وہ باتیں

بلاغت اس میں یہ پابندی اظہار سے آئی

وہ اس کی گفتگو، کلیاں چٹکنے کی صدا جیسے

یہ نرمی اس کے لہجے میں ہمارے پیار سے آئی

کشت رکھتا نہیں اب پھول میرے اسطے کوئی

کر مجھ تک ہر ملک اس زلف خوشبودار سے آئی

یہاں ہے جو بھی یوسف، خود زلیخاؤں کا گاہک ہے
روایت یہ نئی کیا جانے کس بازار سے آئی

وہ اک مغرور سی لڑکی، خوشی جس کا تخلص ہے
مرے پاس آگئی لسیکن بڑے اصرار سے آئی

اندھیروں نے قلیل اکثر اُسی دیوار سے جھانکا
اُتر کر دھوپ میرے گھر میں جس دیوار سے آئی



وہ ساون جس میں زلفوں کی گھٹا چھائی نہیں ہوتی
جو برے بھی تو سیراب اپنی تنہائی نہیں ہوتی

جنابِ عشق کرتے ہیں کرم کچھ خاص لوگوں پر
ہر انسان کے مقدر میں تو رسوائی نہیں ہوتی

سمندر پرسکوں ہے اس لیے گہرا بھی پہنڈرہ
چلتی نڈیوں میں کوئی گسائی نہیں ہوتی

یہ واعظ ہے، نہیں تقریر میں رکھتا جواب اپنا
مگر اس شخص کی باتوں میں سچائی نہیں ہوتی



جہاں ساقی کے ایسا پر کوئی کم ظرف آ بیٹھے
وہاں خوش ذوق بندگان کی پذیرائی نہیں ہوتی

کبھی چہرے بدل کر بھی یہاں کچھ لوگ آتے ہیں
کبھی کچھ دیکھتی آنکھوں میں بینائی نہیں ہوتی

قتیل اکثر یہ دیکھا ہے کسی مفلس کے آنگن میں
برات آئے تو اس کے ساتھ شنوائی نہیں ہوتی

قتیل اُس شخص کا کیا واسطہ میرے قبیلے سے!
دفا کے جرم میں جس نے سزا پائی نہیں ہوتی

معجزہ

بشر کے روپ میں اک دلربا ظلم بنے
شفق میں دھوپ، طلائیں تو اُس کا جسم بنے
وہ معجزات کی حد تک پہنچ گیا ہے قتیل
حروف کوئی بھی لکھوں اُسی کا اسم بنے



دل لگا بیٹھا ہوں لاہور کے ہنگاموں سے
پیاد ہے پھر بھی ہری پور، تری شاموں سے

کبھی آندھی، کبھی شعلہ، کبھی نغمہ، کبھی رنگ
اپنا ماضی مجھے یاد آئے کئی ناموں سے

ایک وہ دن کہ بناں دید تڑپ جاتے تھے
ایک یہ دن کہ بہل جاتے ہیں پیغاموں سے

جب مرے ہاتھ پہ کانٹوں نے دیا تھا بوسہ
وہ برا پہلا تعارف تھا گل انداموں سے

کششِ جمال

قدم قدم پہ کئی خوش جمال ہیں لیکن
کسی میں بات کہاں میرے مرجہیں جیسی
نگاہ جو بھی اٹھے اس کے خال و خد پہ گئے
کششِ ضرور کوئی اکس میں ہے نہیں جیسی

جان و دل دے کے محبت کے خریدار بنے
یہ کھری چیز تو ہلتی ہے کھرے داموں سے

پور بازار میں پکے نہ پہنچ جائے کہیں
جنسِ ایماں کو بنگوا ئے گوداموں سے

پیروی حضرت غالب کی ہوئی نصف قلیل
مے تو ہلتی نہیں رغبت ہے فقط آموں سے



جب کسی جام کو ہونٹوں سے لگایا میں نے
رقص کرتا ہوا دیکھا ترا سایا میں نے

مجھ سے مت پوچھ مرے محتسبِ شہر سے پوچھ
کیوں تری آنکھ کو پیسا نہ بنایا میں نے

لوگ کہتے ہیں قصیدہ وہ ترے حُسن کا تھا
عام سا گیت جو محفل میں سُنایا میں نے



میکدہ بند تھا لیکن جوٹھی گر جا بادل
اپنی توبہ کو چٹخت ہوا پایا میں نے

شعر و نغمات کا رشتہ کبھی ٹوٹا نہ قسّیل
جب غزل بن کے وہ آیا اُسے گایا میں نے



جب سے آیا ہے ترے پیار کا موسم جاناں
دل میں رہتی ہے لگاتار چھپا چھم جاناں

زخم جو تم نے دیے اُن کا سند لیہ یہ ہے
بھینا اب نہ حسد را کوئی مرہم جاناں

جل رہے تھے مری پلکوں پہ جو یادوں کے چراغ
اب تو اُن کی بھی لویں ہو گئیں مدھم جاناں

ٹرک گئی سانس بچھڑنے کی گھڑی جب آئی
دل مگر پھر بھی دھڑکتا رہا پیہم جاناں



باندھ لوں میں بھی تری یاد کے گھنگھرو، لیکن
رقص کرنا بھی تڑپنے سے نہیں کم جاناں

تُو نے چھوڑا نہ کسی روئے عمل کے قابل
اب مرا شعر، نہ شعلہ ہے نہ شبنم جاناں

جانے کیا تجھ سے ہوئی بات کہ گم صُوم ہے قہقہ
اب ترا نام بھی لیتا ہے وہ کم کم جاناں

اب اور تب

کہا اُس نے —

مجھے تب واقعی تم سے محبت تھی

کہا میں نے —

مجھے تو آج بھی تم سے محبت ہے

وہ تب کی بات کرتی ہے

میں اب کی بات کرتا ہوں

مگر جو فاصلہ تب اور اب کے درمیاں حائل ہے

وہ ہم سے توئل کر بھی سیٹھا جا نہیں سکتا

وہ اب تک آ نہیں سکتی

میں تب کو پا نہیں سکتا



دستِ عوام ہو کر گریبانِ شہر یار
اس دُورِ ناسپاس میں دونوں ہیں بے وقار

وہ شور ہے کہ گیت اُبھرتا نہیں کوئی
یوں سدا بچ رہے ہیں کہ گھائل ہے تار تار

آئی نظر اُنق پہ شفق سی کھلی ہوئی
دیکھا تو پڑ رہی تھی وہاں غن کی پھوار

کانٹوں سے کیسا شکایت بیگانگی کریں
پھولوں نے خود ہی کھول دیا رازِ نو بہار

خود فریبی

ہے بیکار کی بحث یہ جھوٹے سچے کی
جیسے بھی ہو اپنی لاج بچ لینا
تیرے در پر دے نہ ہزار اگر دستک
گلے میں کاغذ کے پھول سب لینا

اب دُور تک نہیں کسی آہٹ کی نغمگی
مایوس ہو چلی ہے ہری شام انتظار

سر پر جو آ پڑی ہے تو ہنس کر نبھائیے
حالات پر نہیں ہے کسی کا بھی اختیار

کھائے ہیں وہ فریبِ محبت کے نام پر
اب اپنے آپ پر بھی نہیں ہم کو اعتبار

تُو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خموش
اے دوست میں بھی تیری طرح ہوں گناہگار

شاید کچھ اور بھی میں ترا ساتھ دے سکوں
اے زندگی کبھی تو ٹپٹ کر مجھے پکار

کوئی کسی کی بات سمجھتا نہیں قندیل
مجھ کو اسی لیے تو ہے دیوانگی سے پیار



جب سے لبوں پہ شورِ گلوں ناچنے لگا
شہروں میں ایک عالم ہو ناچنے لگا

جذبات کی برات کچھ اس شان سے چلی
سڑکوں پہ تیرا میرا لہو ناچنے لگا

کتنے مزے کی چیز ہے بہت ہوا لہو
اس نے سے بھر گیا تو سبُ ناچنے لگا

میں ناچتا ہوں صحنِ تڑپنے کے شوق میں
اے دوست کس خیال سے تُو ناچنے لگا

دھوکا ہوا جو رقص پہ کارِ ثواب کا
یہ شیخ حرم بھی کر کے دھوننا چنے لگا

میں ذبح ہو گیا جو قتل اپنے ہاتھ سے
غوش ہو کے اس خبر سے عدونا چنے لگا

شہر آشوب

رشتہ دیوار و در، تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
مت بگرا اس کو یہ گھر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

تیرے میرے دم سے ہی قائم ہیں اس کی دلیں
میرے بھائی یہ نگر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگ میل پر
اس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

شاخ شاخ اس کی ہمیشہ بازوئے شفقت بنی
سایا سایا یہ شعبہ تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے





ہر نئے سورج کی رہ کر پذیرائی کریں
ہم سمجھتے بوجھتے نقصان بینائی کریں

اس جگہ تقدیر لے آئی ترے بیمار کو
جس جگہ حبلا دہی شغل میجائی کریں

نام تیرا ہم نے خود لکھا ہے جب ہر اینٹ پر
کس طرح مسمار ہم دیوارِ تنہائی کریں

پاس میرے آگئے ہو جب تو پھر جلدی ہے کیا؟
آؤ کچھ پسینے بنیں کچھ محفل آرائی کریں

کھا گئی کل ناگماں جن کو فسادوں کی صلیب
اُن میں اک نورِ نظر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

اپنی حالت پر نہیں تنہا کوئی بھی سوگوار
دامنِ دل تر بہ تر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کچھ تو ہم اپنے ضمیروں سے بھی کر لیں مشورہ
گرچہ رہبرِ معتبر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

غم تو یہ ہے گر گئی دستارِ عزت بھی ثقیل
ورنہ ان کا ندھوں پہ سر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

گر معبود عشق میں خلق خدا بھی ہے مگر
کیوں نہ ہم کچھ آپ بھی سامان رسوائی کریں

پھول جن لوگوں میں بانٹے ان کو لازم ہے قتل
پتھروں سے وہ ہماری عزت افزائی کریں



کون کس کے ہاتھ آیا اور کھلونا ہو گیا؟
پھوڑیے اس بات کو جو بھی تھا ہونا ہو گیا

اُس کے کُوپے کی زمیں جس دن سے میں نے اڑھلی
آسمان اُس روز سے میرا بھوننا ہو گیا

دیکھ لوں تو دیر تک لیتی ہے چٹخارے نظر
ذائقہ اب اس کے چہرے کا سلونا ہو گیا



شام کے سورج نے جب ترچھی شامیں ڈال دیں
اپنے سائے کے مقابل میں تو ہونا ہو گیا

میری قیمت ہرن پیتل کے برابر تھی قنصل
پھو کے اُس پارکس بدن کو میں تو مونا ہو گیا



اپنی اپنی سوچ کے صحراؤں میں
ہم بچھاتے ہیں گولے پاؤں میں

جب سنی ہم نے پیپے کی صدا
جا بے بیٹی ہوئی برکھٹوں میں

دل کے دروازے پر دستک سی ہوئی
گھنٹیاں بجنے لگیں آشاؤں میں

خود ہی تھے موجود استقبال کو
ہم گئے جس شہر میں جس گاؤں میں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



چاند تاروں میں کیا جس کو تلاش
وہ تھا میرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں

ہم کھڑے تھے دوڑتوں کے دریاں
دھوپ میں وہ جل گیا میں چھاؤں میں

جا بٹے دریا سمندر سے قسطل
ندیاں گرتی رہیں دریاؤں میں

کیڑا، رزق اور پتھر

تُو ہے تجس کا غوگر تو پہلے

پر بت سے پتھر نکال

پتھر کو توڑ اور پھر دیکھ اُس میں

کیڑا ہے اک بے مثال

صدیوں سے پتھر ہی مسکن ہے جس کا

اور اس کا یہ ہے کمال

پتھر کے اندر وہ رہ کر ہمیشہ

پاتا ہے رزقِ حلال



لیکن جو پتھر سے آجائے باہر
 جینا اُسے ہو محال
 باہر کی دُنیا —
 مالِ حرام اور لالچ کی منڈی
 سرمایہ داروں کی رنڈی
 باہر کی دُنیا —
 اندر سے کالی

انسانیت کے لیے ایک گال
 اِس میں ہے خواب و خیال
 اے دوست —! رزقِ حلال



وہ شخص جس کو مری زندگی میں آنا تھا
 سنا ہے اُس کے تعاقب میں اک زمانہ تھا
 نہ تھا پسند کسی کو بھی دل کا دل سے ملاپ
 مگر ہمیں تو دیے سے دیا جلانا تھا
 نہ جانے بھیگ چلی کیوں ہماری پیشانی
 ہمارے سر پر تو سورج کا شامیانہ تھا
 بہت عروج پہ جب تھے ہمارے قول و قسم
 ہمارے پیار کا وہ آخری زمانہ تھا



بہت قریب بہت ہی قریب تھا صیاد
 قفس سے دُور بہت دُور آشیانہ تھا

تفیل تجھ کو ملی ہے اسی لیے شہرت
 کر ٹو ساج کی تنقید کا نشانہ تھا



نہ دلو لے وہ رہے اور نہ وہ زمانہ رہا
 سماں حیات کا لیکن سدا سہانا رہا

غزل حرام ہوئی، حُسن پر لگے پہرے
 ہر امزاج مگر پھر بھی شاعرانہ رہا

خُدا بھی مان لیا بندگی بھی کی اُس کی
 تعلق اُس سے مگر اپنا غائبانہ رہا

بکھا ہوا مرا ماضی تھا جس کے تنکوں پر
 مری اڑان میں مائل وہ آشیانہ رہا



پروں کے ڈھیر لگے ہیں ہاں ہاں اب بھی
جہاں جہاں کسی بچی کا آشیانہ رہا

کہیں کہیں کوئی راحت، کہیں کہیں کوئی غم
مرے نصیب کا منظر وہی پرانا رہا

قتیل ترکب مراسم وہ کر گیا، پھر بھی
سلوک اُس کا مرے ساتھ دوستانہ رہا



اگرچہ بزم میں درد آشنا بھی کتا ہے
کوئی نہ ہو تو مجھے وہ بُرا بھی کتا ہے

مرے خدا، اُسے جھٹلاؤں کس بہانے سے
وہ اجنبی تو مجھے آشنا بھی کتا ہے

میں اس کے دو غلے پن سے بہت ہی عاجز ہوں
وہ مجھے سے پیار کو اپنی خطا بھی کتا ہے

ہوا ہے اپنا تعارف اک ایسے موسم سے
جو آنندھیوں کو خرام صبب بھی کتا ہے



نوادرات کی قیمت پہ جن کو بیچ سکے
زمانہ ایسے بُتوں کو حُشا بھی کہتا ہے

قتیل تو کبھی داعظ کا اعتبار نہ کر
مذاق سے وہ تجھے پارسا بھی کہتا ہے

لفظوں کی بانہی کا سانپ

کب سے چند لبوں کے پیچھے
رینگ رہا ہے دھیرے دھیرے
لفظوں کی بانہی کا سانپ
یوں لگتا ہے
چند لبوں سے آگے بڑھ کر
یہ زہریلا سانپ کئی ہونٹوں تک جانا چاہتا ہے
بتلاتی ہے کینچی اس کی
بنا ہوا بارود کا ہے اس کا پیکر
ٹھلساٹے جو نظر نظر کو، بدن بدن کو
خطرہ جس سے ڈگر ڈگر کو، چین چین کو

خون کے مارے آنکھ اٹھا کر کوئی نہ اس کی جانب دیکھے
لیکن تو کیا واقعی اس کو دیکھنا چاہیے؟
بڑے شوق سے دیکھ !

لیکن تیرے لیے ہے بہتر
پہلے تو اپنی آنکھوں کو

ڈھانپ لے ٹھنڈے پانی کی عینک سے

اور کنکھیوں سے اس کے زہریلے پن کو بھانپ

تب تو ٹھیک سے جان سکے گا

کیسے تیرے پاؤں سے کچلا جاسکتا ہے

لفظوں کی بانہی کا یہ زہریلا سانپ



صرف ترے ہاتھوں کو چوموں تیری بیعت چاہوں

سو در چھوڑ کے تیری ایک حسین کرامت چاہوں

تھوڑے تھوڑے دن کاٹے ہیں کتنی ہی گلیوں میں
آخری بار ترے دل میں اسے دوست سکونت چاہوں

آ میں کوئی ڈھنگ رکھاؤں تجھ کو بے چینی کا

تیرا دوست ہوں اپنی سی تیری بھی حالت چاہوں

تیرے ذہن کی چاندی اور تیرے جذبات کا سونا

اپنا جسم لٹا کر بھی میں صرف یہ دولت چاہوں

اوپر والا پوچھ ہی بیٹھے مجھ سے تو میں بُزدل
تجھ سے کھل کر باتیں کر سکنے کی ہمت چاہوں

بے غرضی کی آخری حد پر بنا قاتل جو ساتھی
وہی تو ہے اک شخص جسے میں بناں ضرورت چاہوں



چاند بھی راہ میں کیا ہے روشن پھر بھی کوئی نہ آیا
رات گئے حیران کھڑے ہیں میں اور میرا سایا

ستاٹے کے رنگ ہیں لاکھوں کس کس کو پھپھو
میں نے اک پل چا پٹنی اور برسوں دھوکا کھایا

دھوپ کا بھی اک روپ ہے یارو گرم گلابی لیکن
اکثر ٹھنڈے جھونکوں سے بھی رنگ ہرا ستولایا

روتا کیسا ؟ ڈھانپ کے منہ اب میں آہیں بھرتا ہوں
ڈرتا ہوں کہیں جاگ نہ جائے کوئی مرا ہمسایا



خُون کی دشتک

تلچے گا مرا دیوانہ پن
زنجبیر پہن کر چھن چھن
اے دوست نہ رستہ روک مرا
اے دُنیا تو دیوار نہ بن

آزاد ہوا تھا میں پیدا اور مرنے تک آزاد ہوں میں
انکار ہے جس کی فطرت میں اُس آدم کی اولاد ہوں میں
شامل ہے مری مٹی میں اگن
اے دوست نہ رستہ روک مرا
اے دُنیا تو دیوار نہ بن

ہم بے داغ بدن والوں کو نیم برہمنہ کر کے
ہر کوڑھی نے اپنے بدن پر اوڑھ لیا سرمایہ

اپنے اپنے درد کے اندر چھپ گئے ساتھی سارے
زخموں کے اس موسم میں کون اپنا کون پرایا

ساتھ ہمارا کبھی نہ پھوڑا یا ققیل قلم نے
دور نہ اس دُنیا میں کس نے کس کا ساتھ نبھایا



میں اپنے خون کی دستک سے انسان کی آن جگاؤں گا
 تم یہ نہ سمجھنا تیروں سے شمشیروں سے ڈرجاؤں گا
 میں باندھ چکا ہوں سر پہ کفن
 اے دوست نہ رستہ روک ہرا
 اے دُنیاتُو دیوار نہ بن
 ناپے گا ہرا دیوانہ پن

مجبوروں کا میں ہمدم ہوں اور ساتھی ہوں کمزوروں کا
 میں ساتھ کبھی دے سکتا نہیں ان کالے پیلیے چوروں کا
 یہ سب ہیں ترے میرے دشمن
 اے دوست نہ رستہ روک ہرا
 اے دُنیاتُو دیوار نہ بن

احساس کے موتی ہیں جس میں من ساگر کا وہ سیپ ہوں میں
 روشن جو اندھیرے گھر کو دے وہ جگمگ کتاویپ ہوں میں
 آزاد ہے میری کون کرن
 اے دوست نہ رستہ روک ہرا
 اے دُنیاتُو دیوار نہ بن

ظالم کو جس نے لکارا وہ شیریں جیسے روٹھوں میں
 جن لوگوں پہ کوئی ظلم ہوا ان لوگوں کا ہمدرد ہوں میں
 ہر ایک وطن ہے میرا وطن
 اے دوست نہ رستہ روک ہرا
 اے دُنیاتُو دیوار نہ بن



اسیری کے نشاں سارے کے سارے بر محل رکھنا
جہاں چھنکی ہوں زنجیریں وہیں زلفوں کے بل رکھنا

تمہیں بے کیف کرنے کو نہ جانے کب بدل جائیں
اُن آنکھوں کا تم اپنے پاس کچھ نعم البدل رکھنا

رہا ہے ربط میری شاعری کا اس کے ہونٹوں سے
ٹکڑا جائے تو اُس کے سامنے میری غزل رکھنا

زلزلے

دشکیں دے رہی ہے مثبت
سوئے والا مگر سو رہا ہے
کچھ تو مطلب ہے ان زلزلوں کا
کچھ تو زیرِ زمیں ہو رہا ہے

کبھی اپنی جفا پر وہ پشیمیاں ہو بھی سکتا ہے
مگر تم فیصد ترکب مجتہد کا اٹل رکھنا

ہزاروں آرزوؤں کو بسا بیٹھے ہو کیوں دل میں
نہیں آسان گھر میں اتنے مہماں آج کل رکھنا

ہواؤں سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر دائرے جس میں
قتیل اُس جھیل میں ہو لے سے یادوں کے کنول رکھنا



اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا
تمناؤں کی ہر وادی میں آہستہ قدم رکھنا

حیمنوں کی وہ محصل ہو کہ دربار شہنشاہی
کہیں اچھا نہیں ہوتا سر تسلیم خم رکھنا

دلوں میں پیار ہے اپنا، بلوں میں اس کا سر پایا
مدد کے سامنے یا رب تُو ہی میرا بھرم رکھنا

اُسے یس ڈھانپ لینا چاہتا ہوں اپنی پلکوں میں
الہی اُس کے آنے تک ہری آنکھوں میں دم رکھنا

یہی کچھ درمیانِ دین و دنیا ہم نے دیکھا ہے
لگانا نو خدا سے اور پسلو میں صتم رکھنا

قتیل اب بھی سیمائی کا دعویٰ ہے انھیں لیکن
کرم کی اس اپنے قاتلوں سے پھر بھی کم رکھنا

ایک انوکھی لڑکی

انگ ہے اُس کا پھول سا رنگ بے لال گلاب
دل موہ لینے میں اُسے حاصل بڑا کمال
ایک نظر میں کھینچ لے جاتے راہیوں کو
جادو اُس کی بھانجھنیں مقناطیس جہاں

مانتا اچلے چاند سا ہونٹ اس کے عتاب
لڑکی ہنستی بولتی جیسے کھلا گلاب
محبوبہ اُسے جان کے پیش کیا جو پان
کہہ دے گی وہ آپ سے ”بھیتا جی آداب“



کبھی سراسر مہر ہے، کبھی وہ قہر ہی قہر
وہ لڑکی کے رُوپ میں کچھ امت کچھ ذہر
کوئی نہ سارے شہر میں جانے اس کا نام
پھر بھی اُس بے نام کو پہچانے سب شہر



اُس کی زلف کے سائے سائے چلا کرو
جلتے لوگو — کچھ تو اپنا مہلا کرو

پیار کی آنچ نکھار کا باعث بنتی ہے
جلتا ہے تو پیار کی آگ میں جلا کرو

پیڑ یہاں کچھ سدا بہار بھی ہوتے ہیں
کوئی موسم ہو تم پھولا مہلا کرو

کوئی منظر پاؤں کی زنجیر نہیں
وادی وادی آزادی سے چلا کرو



جان بچاؤ تنگ نظر انسانوں سے
کچھ اپن کچھ خلقِ خدا کا سبلا کرو

پھندا جس کو پورا، پھانسی چڑھے وہی
کس نے کہا تھا سامنے اپنا گلا کرو

غم کو اور بڑھاتی ہے یہ ہنسی قتیل
چہرے پر یہ عتہ کم کم نکلا کرو



اس دھرتی کے شیش ناگ کا ڈنک بڑا زہریلا ہے
صدیاں گزریں آسمان کا رنگ ابھی تک نیلا ہے

میں ہوں اپنے پیار پہ قائم اُن کی رسمیں وہ جانیں
اور ہے ذاتِ حسینوں کی اور میرا اور قبیلہ ہے

میرے اُس کے ہونٹ بلیں تو کھلیں ہزاروں پھول مگر
کچھ تو میں چُپ رہتا ہوں کچھ یار میرا شرمیلا ہے

آنسو ٹپکے ہوں گے ان پر، حرف بھی تو پھیل گئے
رویا ہے خط لکھنے والا، بھی تو کاغذ گسیلا ہے



میں نے کہا دو اجنبیوں کے دل کیسے مل جاتے ہیں
پیارے بولی اک دیوی یہ سب بھگوان کی لیلیا ہے

یوں ہی تو نہیں کہتا رہتا نظمیں، غزلیں، گیت قلیل
یہ تو کسی کی محفل تک جانے کا ایک وسیلہ ہے



یوں لگتا ہے لاش ہماری موم کا پھنٹے ہوئے کفن ہے
پھینکے گئے سمندر میں ہم پھر بھی اپنا خشک بدن ہے

کیوں تالاب میں عکس ہمارا صاف نظر نہیں آتا لوگو
یا کچھ مسخ ہے چہرا اپنا، یا پانی میں گدلا پن ہے

کون سا بدلہ ہم سے لینے بھیجی گئی برسات فلک سے
کہاں سے بچ کر گزرے کوئی ساری گلیوں میں بھیلن ہے

رب کو خوش کرنے کے بہانے کرے دل آزاری بندوں کی
اک موذی بس اسی کام میں بڑے خلوص کے ساتھ مگن ہے



اُسی کے گھر سے ہوگا برآمد لٹا ہوا سب مال ہمارا
ہم دہبر سمجھے تھے جس کو وہ اک پشتینی رہزن ہے

ہر بن باسی ہے خطرے میں جاننا چاہیے ہر سیت کو
جہاں کہیں ہے کوئی لشکا دھاں کا راج پتی رادن ہے

کون بتائے کس ظالم نے آکر توڑ دیے سب جھولے
چُپ ہیں کوئلیں اور پیچے خوب قتل آج کے رادن ہے

میلی روشنیال

سُن کر شور فضا میں تیز ہواؤں کا
چار طرف واویلا ہوتے دیکھا ہے
گرد اُڑاتی آنکھوں کے چھو لینے سے
روشنیوں کو میلا ہوتے دیکھا ہے





کچھ ذی ہنر جو بے ہنروں کی طرح پیچھے
اپنے ہی گھریں در بہ دروں کی طرح پیچھے

انساں کو چاہیے کہ مسافر نواز ہو
جنت پیچھے ہرے شجروں کی طرح پیچھے

رکھے وہ اپنی آنکھوں پہ اپنا بریدہ سر
جو چاہتا ہو دیدہ دروں کی طرح پیچھے

دین بے وجود

تو کئی بار ہوا قتل مگر اے مرے دل
ترے مرنے پر یہ دنیا کیسی روٹی بھی نہیں
تیرا مذہب تو ہے بس مذہب انسانیت
اور اس نام کا مذہب یہاں کوئی بھی نہیں

جن کے سروں میں کیفیت تھا اوروں کے واسطے
ہم اُن اُداس نعمت گروں کی طرح پیچھے

مُحکمت قلیل ہم کو نہ آیا تمام عمر
جب تک پیچھے کشیدہ سروں کی طرح پیچھے



افشائیں اک جھلک میں کہانی وہ کر گیا
اپنے بدن سے شعلہ سبانی وہ کر گیا

بھونکا لگا وہ ٹھجے کو بسنتی ہواؤں کا
آیا تو میری شام سہانی وہ کر گیا

لکھ کر چلا گیا، مرے پہرے پر اپنا غم
مجھ کو عطف عجیب نشانی وہ کر گیا

سو جان دے کے بھی نہ کسی کو وفا ملے
دل کے تگر میں ایسی گرانی وہ کر گیا



اب اُس کی چال دیکھ کے بہتی ہیں ندیاں
پابند پانیوں کی روانی وہ کرگیں

مُجھ سے انا پرست نے چاہا اُسے قتل
پتھر کو اپنی آنچ سے پانی وہ کرگیں

روئے نعمت

اونچے محل میں جس طرف جاکر وہاں یلع ر کر
رکن من برس، رم جھم برس، چھجوں برس، چھجوں برس
لیکن برا کچا مکاں شاید نہ تجھ کو سہہ سکے
بلکہ اے ابر کرم! مسیدی طرف کم کم برس





غبارِ رہگزر جب پردہِ محفل پر گرتا ہے
ہر اک ذرہ کسی محفلِ نشیں کے دل پر گرتا ہے

کسی پیاسے کو پانی جس طرح مل جائے صحرا میں
تھکا ہارا مسافر اس طسرح منزل پر گرتا ہے

اڑاتی ہے مذاق اس کا بھنور کی حشر سامانی
کسی قلع کا پتوار جب ساحل پر گرتا ہے

تجھے دے گا رعایت اس غلط فہمی میں مت رہنا
عتاب اس کا جو گرتا ہے تو سب محفل پر گرتا ہے

تَحْفِظ

جہاں میرے بھٹک جانے کا اندیشہ ہوا پیدا
وہیں رستہ دکھایا دودھ جیسی کچھ صداؤں نے
کوئی خطرہ قسطل آیا جو نہی مجھے پر پھینٹنے کو
مجھے اپنے پردوں میں لے لیا ماں کی دُعاؤں نے

رعونت سے جسے پھینکا گیا ہو بے گناہوں پر
وہی خنجر پلٹ کر سینہ قاتل پہ گرتا ہے

جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پر کہہ دو قیل اُن سے
جو دامن پر نہیں گرتا۔ وہ اُنسو دل پہ گرتا ہے



ضروری چیز جو مانگو وہی اکثر نہیں دیتا
وہ کرتا ہے عطا شرم دیا، چادر نہیں دیتا

سگوں کو تو اجازت اس نے دی ہے کاٹ کھانے کی
حفاظت کے لیے ہم کو مگر پتھر نہیں دیتا

زمانے سے انوکھی دین ہے اس دینے والے کی
وہ دیتا ہے درو دیوار لیکن گھر نہیں دیتا

اکیلا حرف ہوں اور داستاں بننے کی حسرت ہے
مگر مجھ پر توجہ وہ فسانہ گر نہیں دیتا



کمانی ختم ہوئی

اپنی اکوتی بہن بیگم اختر اورنگ زیب کے لیے
جو ۱۱- مئی ۱۹۸۶ء کو اچانک تجھے تنہا چھوڑ گئیں

کھلی جب آنکھ مری اپنی ماں کے پہلو میں
تو پہلا باب کمانی کا ہو رہا تھا شروع
لبوں پہ حُرم نکھرتے نہ تھے مگر پھر بھی
یہ آرزو تھی کہ ہو ایسی کوئی شکل طسوع
جو تجھے کو اپنے خد و خال سے نہال کرے
جو میرے چہرے کو سوئے سب اپنے نقش و نگار
جسے میں سوئے سکوں اپنا رنگ تُو پ تمام

مجھے تو یوں لگے جیسے کفن پر ہے نظر اُس کی
میں ہے تو کیوں مردوں کو زندہ کر نہیں دیتا

سنا ہے کھول بھی دیتا ہے وہ پنجرے کا دروازہ
مگر اڑنے لگیں نیچھی تو ان کو پر نہیں دیتا

عنایت ہے قاتل اس کی فقط کچھ خاص لوگوں پر
سخی وہ ہے تو پھر کیوں میرا دامن بھر نہیں دیتا



اور اس نے میری تمام آرزوئیں
گھول کے گھٹی میں جیسے پی لی ہوں۔

کمانی آگے بڑھی
ایک باب اور کھلا
مجھے اگر کوئی پتھر لگا تو وہ تڑپی
اگر کبھی مرے اعلیٰ نے ستیا مجھے
آنکھ اُس کی بھرائی
اگر کہیں سے کوئی تیر مجھ پہ پھینکا گیا
ڈھال اُس کے ہاتھ بنے
اگر کبھی مرے حالات مجھ سے دُٹھ گئے
جا کے وہ منالائی
اگر کبھی مجھے شکوہ ہوا زمانے سے
اُسی نے زندگی نو کا حوصلہ بچٹا
جو مسکراہٹیں مرے ہونٹوں پہ آگئی ہیں کبھی
اُسی کی دین تھیں وہ
جو منزلیں مرے قدموں پہ مہربان ہوئیں

کوئی اگر اُسے دیکھے تو مجھ کو یاد کرے
سو ایسا ہو کے رہا —

جب اس کی آنکھ کھلی اپنی ماں کے پہلو میں
اک اور باب کمانی کا ہو گیا تھا شروع
جو ایک شکل نظر آئی ماں کے بعد اُسے
وہ میری شکل تھی

اور میری شکل میں شامل
اُسی کے نقش اُسی کا جیل چہرہ تھا
وہ میری شکل کے آئینے میں تھی عوایے
کہ صرٹ میرے خدو خال اس کے دھیان میں تھے
وہ اپنی ذات بری ذات میں سموئے تھی
کہ میری آنکھوں میں جو اُس کا عکس تھا وہ بھی
بری ہی شکل میں تبدیل ہوتا جاتا تھا
وہ ماں کی گود سے مجھ کو ہمک ہمک کے ملی
کہ جیسے میری تمناؤں کے سبھی سائے
پڑے ہوں صبح ازل اُس کے بھی خیالوں پر

تو اُس کی راہبری کا کمال تھا یہ بھی
نماز اس لیے پڑھتی رہی کہ میرے لیے
دُعا کوئی نہ کوئی وہ خدا سے مانگ سکے

کہانی آگے بڑھی

نکتہ عروج آیا —

اک ایسے وقت کو لے کر، کہ اس کی مشعلِ جاں

مرے لیے ہی نہیں جل رہی تھی سب کے لیے

وہ روشنی کی علامت تھی زندگی کا نشان

اُسے شعور تھا آدابِ آدمیت کا

وہ مسکراتے ہوئے سب کے غم بٹاتی رہی

جو سب کو راہ دکھاتی رہی وہ میری بہن

اکیسی آج اک ایسے سفر کو چل نکلی

جہاں سے لوٹ کے آیا نہ کوئی آج تک

کہانی ختم ہوئی —



چمک آتی ہے آنکھوں میں کبھی کچھ سائے آتے ہیں
اُسے تو بات کرنے کے بھی پیرائے آتے ہیں

خریدار اپنا ہوسکتا نہیں کمتر زینما سے
جھی تو ہم سربازار بن شرمائے آتے ہیں

ہمیں اب محضِ خواباں تک آتے ہیں تائل ہے
مگر جب وہ بُلا بھیجے تو سر نہ ہٹائے آتے ہیں

ہماری خامشی نے کر دیا حساس لوگوں کو
لگے پتھر ہمیں تو جوش میں ہمسائے آتے ہیں

قتیل اہل و عیال اپنے جنہیں فرصت نہیں دیتے
دکھی بہنوں کو اکثر یاد وہ ماں جائے آتے ہیں



اگر وہ شخص خود چل کر تمہارے پاس آیا ہے
تو اُس کی جیب میں سرمایہ احساس آیا ہے

گیا تھا نوکری کرنے عرب کے تاجداروں کی
بڑے آرام سے وہ کاٹ کر بن باس آیا ہے

بنا سکتا تھا جو اپنے قلم سے دل کی تصویریں
وہ بن کر صرف اپنے جسم کا عکاس آیا ہے



ہوم سیک

(HOME SICK)

(سات سمندر پار کی ایک سوچ)

نہ اس سے میری دشمنی نہ اس سے مجھ کو بُر ہے
اس ایک شہر میں ہزار جنتوں کی سیر ہے
مگر نہیں —

دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

بڑے حسین زاویے کبھی تھے میری سوچ کے
مگر کسی نے رکھ دیا مرے پردوں کو نوچ کے
چلا تھا آسمان کو، زمیں پر آگرا ہوں میں
جو ٹوٹ کر بکھر گئے وہ خواب چن رہا ہوں میں
سنا تھا اس دیار میں ہر آدمی کی خمیر ہے
مگر نہیں —

دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

غنیمت ہے کہ جاں دے کر ملی فریاد کو شہرت
وگرنہ جذبہِ ایثار کس کو داس آیا ہے

قتیل اب ساحلوں کی ریت بھی ہوجس کی مٹھی میں
سمجھ لینا وہ لے کر گوہر و الماس آیا ہے

اگرچہ ہر طرف یہاں برس رہی ہے زندگی
وہ پیاس ہے کہ نہر کو ترس رہی ہے زندگی
یہ زندگی دکھوں میں ہم گزارتے ہیں جس طرح
کرے طول آدمی اسے قبول کس طرح
یہ ٹھیک ہے، ملا ہوا یہاں حرم سے دیر ہے
مگر نہیں —

دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

گھٹا گھٹا ہے دم مرا، صبا کو ڈھونڈتا ہوں میں
پھر اپنے دس کی کھلی فضا کو ڈھونڈتا ہوں میں
قدم بڑھاؤں کس طرف کروں میں کس سے مشورہ
کہاں ہے میرا یقرا، کہاں ہے میرا ایشیا
یہاں تو اپنی زندگی سکون کے بغیر ہے
نہیں نہیں —

دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے



جو پل صراط بناتے ہیں رہنمائی کی جگہ
وہ دھوپ لاکے نہ رکھ دیں کہیں شجر کی جگہ

بلا دلوں کا بہت زور ہے مرے آقا
صدف سے ریت نکلتی ہے اب گہر کی جگہ

کہاں سے مانگ کے لائیں وہ لوگ بینائی
بلا فریب نظر جن کو اک نظر کی جگہ

وہاں جھکا یا گیا سر علوم و دانش کا
عیوب ہیں جہاں مسند نشین ہنر کی جگہ

جو بن بٹائے مسائل یہاں چلے آئے
پسند ہے برا گھر اُن کو اپنے گھر کی جگہ

قتیل تجھ کو بے کیسا وہاں پیامِ سحر
سکوت کا ہو تسلط جہاں گجر کی طرح



خوش رہ کے بھی آنکھوں سے بات کرتا ہے
وہ چاندنی کے تکلم کو ماست کرتا ہے

گلے نہ ملے، کم مصافحہ بھی نہیں
معطر اب بھی ہمیں اُس کا ہاتھ کرتا ہے

نبھا رہے ہیں کچھ ایسے ہم اُس سے یارا نہ
عبور جیسے کوئی پُل صراط کرتا ہے

نہیں ہے کم کسی شب زندہ دار سے وہ شخص
بسر جو آنکھوں میں فرقت کی رات کرتا ہے



روانگی کی اجازت عطا کرے بھی تو عشق
ہزار تہمتیں عاشق کے ساتھ کرتا ہے

جو مہرباں ہو کسی پر کوئی حسیں قاتل
کہاں پسند وہ زہر حیات کرتا ہے

ست سے نام تھے اُس کی بہت سی غزلوں میں
پر اب قاتل ذرا احتیاط کرتا ہے

احتساب

ٹوٹ بھی جائیں دُنیا بھر کے اُٹنے
کیا یہ گرگٹ جیسے رنگ بدلتے چہرے
بچ جائیں گے بھیلوں اور تالابوں سے؟



شوقِ جلوہ ہے مگر ذوقِ نظرِ نابینا ہے
آئینے کے سامنے رکھا ہوا آئینہ ہے

صرف اک نظارہ دے کرے گیا آنکھیں کوئی
زندگی نے جو دیا اُس سے زیادہ پھینا ہے

پیاکس یوں بھڑکی ہری احساں ایندھن بن گیا
حسرتوں کی آگ سے روشن ہوا اب سینہ ہے

منزل مقصود

جلا دوں سے خوف آئے جس غیرت کو
وہ غیرت بازار میں حب کر چھوڑ آؤ
جن لفظوں کا حسن قلیلِ خوشامد ہو
انہیں کسی دربار میں حب کر چھوڑ آؤ

ان دنوں میں صبر کی دولت سے مالا مال ہوں
یہ مرا حق تھا اسے زخموں سے میں نے چھینا ہے

دشمنوں کے ہاتھ آخر یک گیا وہ بھی قتل
اک چھپا قاتل جو میرا ہمدرد دیرینہ ہے



کرہے تھے قریہ قریہ زندگی کی جستجو، میں اور تُو
ہو گئے آوارگی کے نام پر بے آبرو، میں اور تُو

تھے جہاں رسموں رواجوں کے اندھیلوں پر فلا، اب اُس جگہ
معذرت بن کر کھڑے ہیں روشنی کے دُور، میں اور تُو

کچھ دنوں سے میں تیری اور تُو مری مہمان ہے کیا شان ہے
بن چکے ہیں عکس جاں اک دوسرے کا ہو بہو، میں اور تُو

آج کی ساری بہاریں آج کی ہر اک فزائے نامہاں
مُت نہی کب آئے گی کب ہوں گے آخر غمِ دُعا میں اور تُو



کل بھی اپنی ذات میں ہم سرمد و منصور تھے، سرمد و منصور تھے
کر رہے ہیں آج بھی ذوقِ انا کی آرزو، میں اور تُو

یہ ضروری تو نہیں حرف و صدا پُر زور ہو، اک شور ہو
بند ہونٹوں سے بھی کرتے آرہے ہیں گفتگو، میں اور تُو

اس گلستاں میں قلیل اب نعلی کے راز داں ہوں گے کہاں؟
دو ہی رہ جائیں گے باقی سارا آنِ خوش گلو، میں اور تُو



رُو برو وہ ہے عبادت کر رہا ہوں
اُس کے چہرے کی تلاوت کر رہا ہوں

لو خریدو اک نظر کے مول مجھ کو
اپنی قیمت میں رعایت کر رہا ہوں

لی ہے صبر و ضبط نے مجھ سے اجازت
اپنے مہمانوں کو رخصت کر رہا ہوں

چھن گیا ملکِ جوانی بھی تو کیا غم؟
اب بھی یادوں پر حکومت کر رہا ہوں



فلش بیک

FLASH BACK

بہی کی ایک شام
میں نے کی تھی جو کبھی
اک دلربا دیوی کے نام

وہ شام یاد آنے لگی
دھڑکن مری گانے لگی
کھٹکے مری یادوں کے جام

کوئی بھی غم اُس کو لوٹایا نہیں ہے
یوں امانت میں خیانت کر رہا ہوں

اُس نے تو بس اک ذرا سی بات چھڑی
میں وضاحت پر وضاحت کر رہا ہوں

عشق کر کے آپ بھی بن جائیں انسان
شیخ صاحب کو نصیحت کر رہا ہوں

عاشقی طوفانِ گریہ چاہتی ہے
اور میں آہوں پر قناعت کر رہا ہوں

آسمان جو شخص ہے سب کی نظر میں
اُس کو چھو لینے کی جرأت کر رہا ہوں

میں نے دیکھا ہے قلیل اُس کا سراپا
میں کہاں ذکر قیامت کر رہا ہوں

وہ مورتی مر مر کی ہے
آخر تو وہ پتھر کی ہے
اُس کو بھی کیا اب تجھے کام

میں کیا کہوں کیسی ہے وہ
جیسا ہے تو ویسی ہے وہ
دونوں مسافر بے مقصد

مست جا پڑنے دور میں
تُو بھی مست لاہور میں
اب بمبئی سی کوئی شام
افسانے کو دے اختتام

میں ذرا سا کھو گیا
جیسے نشہ سا ہو گیا
کرنے لگا خود سے کلام

شاعر تجھے کچھ یاد ہے
وہ بُست جہاں آباد ہے
اپنا دہاں جانا تھا عام

پر وہ زمانہ اب کہاں
رنگینیاں وہ سب کہاں
اُٹھکی نہ اب یادوں کی تمام

تُو یاد کرتا ہے کسے ؟
بھیا نہیں تُو نے چھے
لاہور سے کوئی پیام

پر مجھ کو اُس پر بھی ہے شک
تُو کر رہا ہے آج تک
جس کے لیے نیندیں حرام



پیتا ہے خون اپنا، حالات کے گلوں میں
انگور دوڑتا تھا، جس شخص کی رگوں میں

بے آب سے یہ پھرے جذبوں سے ہیں جو ماری
کیا ڈھونڈتے ہو یارو، ان کا بچ کے گلوں میں

ہر چہرہ معتبر ہے، کس کس سے بچ کے چلے
ہم گھر کے رہ گئے ہیں اس شہر کے ٹھگوں میں

ہاتھیوں کا لشکر

چار سو بڑھتے اندھیروں سے نہ ڈراے گل زمیں
رات پھیلے گی تو قسمتیں بھی آئیں گی یہاں
ہاتھیوں کا ایک لشکر سامنے ہے بھی تو کسب
سنگ درمنقار ابابلیں بھی آئیں گی یہاں

بیکار ہو چکے ہیں ، انبار پتھروں کے
لوہے کی کھال جبکے ، بانٹنی گئی سگوں میں

کس کام کا ققیل اب یہ دوپہر کا سونا
برباد عمر کر دی ، تم نے تو رتھبگوں میں



کیا حین آنچ ہے مگر قریب جائے کون
اُس بدن کو چھو کے اپنی انگلیاں جلائے کون

کھو گئے جو گیسوؤں کے ریشمی طلسم میں
اُن کو واپس اپنی اپنی چھاؤں میں بلائے کون

کس کے عشق میں ہے دم کہ تاج اک نیا بنے
اب دوبارہ پتھروں کو چاندنی پلائے کون

کس کے ہاتھ آسکی ہیں بادلوں کی ٹولیاں
مٹھیوں میں بند کر سکا ہے ان کے سائے کون



دو عادتیں

میری دو عادتیں تھیں
ایک سگریٹ — ایک محبوبہ
کہا احباب نے مجھ سے
کہ محبوبہ کو چھوڑا جا بھی سکتا ہے
مگر سگریٹ نہیں چھوڑتا —

کہا میں نے
کہ اے میرے جہاں دیدہ رفیقو، دوستو
سُن لو —

شہر میں عجیب سی خبر اُڑی ہے قتل کی
اُس گلی میں اپنی لاش دیکھنے کو جائے کون

جب نہ ہو گا ایک بھی مسافر اس زمین پر
تب چلائے گا بھلا یہ کارواں سر لٹے کون

سارے موسموں کی ہے قتل جب خبر ہمیں
بجلیوں کے واسطے پھر آشیاں بنائے کون



تھارے تجربوں سے معذرت کرتے ہوئے
سگرٹ کو پھڑا آج سے میں نے
مگر وہ میری محبوبہ —؟

وہ اب دہرا سرور زندگی دینے کو
سگرٹ کی طرح میرے لبوں کی لاج رکھے گی
نہ ہونے دے گی سگرٹ کی کمی غم کو
— مری اب ایک ہی عادت ہے

محبوبہ —



ایک گم مُٹم فضا کے سوا کچھ نہ تھا میری چُپ چاپ حیرانیوں کے لیے
اب کے سادوں میں بھی میں ترستا رہا گنگناتے ہوئے پانیوں کے لیے

جب بھی نیکی بدی کا پڑا رن کوئی، جو بھی ناصح تھا وہ پیٹھ دکھلا گیا
سہ گئے ہم ہی محرومیوں کے رستم، رہ گئے ہم ہی قربانیوں کے لیے

کیا خبر کیا خیال آیا صیبت دکو، اُس کے دل میں بھی اک نرم گوشہ بنا
اب رہائی کے پیغام آنے لگے تیرے خود دار زندانیوں کے لیے

جھونپڑوں میں سسکتی ہوئی بیویو! ہوں گے خالی تھائے لیے وہ محل
جو محل تاجداروں نے بنوائے ہیں اپنی پیاری مہارانیوں کے لیے



چاہے کوئی بھی ہو، کیوں غمناک کریں عاشقوں سے تو یہ کام ہوتا نہیں
کوئی شاعر ہی بلووا لو دربار سے گلِ رُخوں کی شناخانیوں کے لیے

جوش پر ہے طبیعت قلیل آج کل سامنے جو بھی آیا وہ بہہ جائے گا
یہ ندی اک زمانے سے مشہور ہے اپنی مٹنے زور طغیانیوں کے لیے



باہر کی چمک بھی کیا کم تھی، پر بہت کچھ اس کے اندر تھا
یہ جان کے میں حیران ہوا، ہر لونڈ میں ایک سمندر تھا

ڈا ہونا تھا جن ہونٹوں کو، اُن ہونٹوں پر اُننگل رکھ دی
اک شخص نے اس کو روک دیا، طوفان جو میرے اندر تھا

اپنے چہرے کو ترس گیا، جب پتھر برسے عبرت کے
تھا ریزہ ریزہ آئینہ، اور خستہ حال سکندر تھا

عزت بھی ملی شہرت بھی ملی، پر اپنے آپ میں سمٹ رہا
نور و لیتیوں کی دُنیاس میں، اک شخص ققیل قلندر تھا



میں خُدا سے کیا کہوں؟

حضرت عیسیٰؑ کو جب مصلوب کرنے آئے لوگ
 تاج کانٹوں کا سجایا اُن کے سر پر
 پاؤں اور ہاتھوں میں کیلیں گاڑ دیں
 کچھ تے ٹھوکا اُن کے مُنہ پر
 کچھ نے اُن کو گالیاں دیں
 جب یہ سارے ظُلم اُن پر ہو رہے تھے
 آپ نے
 آسمان کی سمت دیکھا اور کہا
 اے خُدا! —
 تو انہیں کر دے معاف

گوئنگے میرے شہر کے

کچھ روز پہلے تازہ ہوا جن پہ تھی حرام
 وہ بھی دل و دماغ کے دُر کھولنے لگے
 اپنے وطن کی صورتِ حالات دیکھ کر
 گوئنگے بھی میرے شہر کے اب بولنے لگے

ان کو اشنا بھی نہیں معلوم
یہ کیا کر رہے ہیں۔

اور پھر صدیوں کے بعد
میں کہ صرف اک شاعرِ معتبوب ہوں
عیسےؑ نہیں

ایک چوراہے میں سب کے سامنے مصلوب ہوں
میرے درپے بھی ہر ماحول ہے
میرے پاؤں اور ہاتھوں میں بھی کیلیں گڑبگی ہیں
اور میرے مُنہ پہ تھوکا جا رہا ہے
مجھ کو بھی دی جا رہی ہیں گالیاں

آسمان کی سمت میں بھی دیکھتا ہوں
دیکھتا ہوں اور دل میں سوچتا ہوں
میں خُدا سے کیا کہوں —؟
میں کہ جو عیسےؑ نہیں



شرمندہ انھیں اور بھی اے میرے خُدا کر
دستارِ جنیں دی ہے انھیں سر بھی عطا کر
ٹوٹا ہے سدا جس نے ہمیں دوست بنا کر
ہم خوش ہیں اُسی شخص سے پھر ہاتھ ملا کر

ڈر ہے کہ نہ لے جائے وہ ہم کو بھی چُر کر
ہم لائے ہیں گھر میں جسے مہمان بست کر

اک مَوجِ دبلے پاؤں تعاقب میں چلی آئی
ہم خوش تھے بہت ریت کی دیوار بنا کر

ہم چاہیں کر بل جائیں ہمیں ڈھیر سے موتی
سیر بھی کسی بے نام سمندر میں لگا کر

درکار اُجالا ہے مگر سسے ہوئے ہیں
کر دے نہ اندھیرا کوئی بارود جلا کر

لے اُس نے ترا کا سہ جاں توڑ ہی ڈالا
جاگوچر قاتل میں ققیئل اور صدا کر



بھائی ہوئی گھنگھور گھٹا ہے مرے سر پر
پھر بار سبُو آن پڑا ہے مرے سر پر

یہ گردِ مسافت ہے کہ منزل کا ہیولا؟
اب کون بتائے کہ یہ کیا ہے مرے سر پر

گو بیت چُکا ہے وہ محبت کا زمانہ
تھوڑا سا مگر قرضِ وفا ہے مرے سر پر

حاصل ہے محبت مجھے اک جانِ سخن کی
بیٹھا ہوا کچھ دن سے ہما ہے میرے سر پر



بے ساختہ یاد آیا ہے کوئی نہ کوئی دوست
پتھر کوئی جب آن لگا ہے مرے سر پر

تم چاہو تو دستار بھی کہہ سکتے ہو اس کو
ورنہ یہ تکبر کی سزا ہے مرے سر پر

بدے گا سماں ، پھول بنیں گے ہرے غنچے
اے دورِ خزاں ! دستِ صبا ہے مرے سر پر

جائے گا قتلِ اب بھی خطا ، وارِ عدو کا
میں جانتا ہوں میرا خدا ہے مرے سر پر

شانزے لیزے

— پیرس کا خوبصورت مرکزی بازار —

اجنبی او اجنبی —

ٹن ہری آواز ٹن

دیکھ مجھ کو غور سے

شانزے لیزے ہوں میں

تو نے اپنے دلیں میں

نام تو میرا سنا ہوگا ضرور

میں کہ اک بازار ہوں

خوبصورت باوقار

شہرِ پیرس کا سنگار

درد کی شدت سے اُن کے ذہن اُن کے حافظے
اپنی آزادی کی منزل بھول جائیں
اور پھر

سر جھکائیں آمریت کی سیہ دلیز پر
غیر ملکی فوجیوں کے بوٹ جب روندیں
ہری تہذیب، میرے امن کو
میری سرزمین اس قدر چھینیں
کہ ان کے شور سے

امن و آزادی کے سارے گیت
چُپ ہو جائیں گونگوں کی طرح
لیکن اے میرے مسافر
میرے پیارے اجنبی
ایک دن ایسا بھی آیا

میری سڑکوں پر چمکتے پتھروں میں جاگ اٹھتی بھٹیوں سے
میری گلیوں میں بھرتے شہریوں کی انتقامی قوتوں سے
میرے اُبھڑے ریسٹورانوں میں دوبارہ زندہ ہوتی نمکی سے

میری سڑکوں کے چمکتے پتھروں پر
آج تیرے پاؤں کس شائستگی سے پڑ رہے ہیں
کیوں کہ تو شاعر ہے نازک دل کا مالک
اور شاعر ہی سمجھ سکتا ہے ہر دھرتی کے دکھ کو
چاہے شاعر ہو کسی بھی دیس کا
تُو نے شاید اُن لیے ہوں گے وہ نرے
جو رہے ہیں اب بھی میری خاک میں
جن میں چلاتے ہیں

ماضی کے بھیانک چار سال
جب کہ ہٹلر اور اس کے چند جرنیلوں نے
میری خاک میں
جو دیے تھے آمریت کے سلاسل
تاکہ اُن سے

بُور و استبداد کی زہریلی سنگینیں اگیں
اور میری خوشنما سڑکوں پہ پلتے راہرو
اپنے پیردوں میں کریں محسوس پابندی کے زخم

میری مٹی میں تڑپتے گرم جذبوں کی عقابی جدتوں سے
میرے دریا سیں کی بڑھتی ہوئی طغیانوں سے
سر بلند "ایفل" کے معیار ہنر سے

میرے گرجوں کے گجر سے
شہر کے ایک ایک گھر سے

اٹھنے والی ایک سی آواز سے کھا کر شکست
جب غلامی کا ہر اک ظالم پیامی

اپنے آمراد جبر نیلوں سمیت
اس طرح بکھرا کہ ذرے بھی نہ بکھرے ہوں کبھی
اور اس دن —

اک نئے سورج نے یہ تحریر لکھ دی
اپنی کوئل روشنی سے

اب کوئی آمر نہ آنے پائے گا
پیرس کے اس بازار تک

شانزے لیزے جے کتی ہے دنیا

شانزے لیزے جے جمہوریت سے پیار ہے



روشنی چاہیے صبا کے لیے
پھول روشن کرو خدا کے لیے

اُس کو اتن بھی مہرباں نہ کہو
ہم ترس جائیں گے دفا کے لیے

عشق کی انتہا کے معلوم
جان کافی ہے ابتدا کے لیے

بے گناہی جو شرط ٹھہری ہے
ہم کو چن لیجیے سزا کے لیے

پارسائی ہے بُزدلی کا نام
عصہ چاہیے خطا کے لیے

ہر کسی پر قاتیل کیوں آتا
دل تھا صرف ایک دلِ بُرا کے لیے



جسم کے جزیرے میں یہ جو دل کی وادی ہے
اس پہ راج ہے جس کا تُو وہ شاہزادی ہے

اپنے در پہ سجدوں کی راہ کیا دکھا دی ہے
تُو نے میرے ماتھے پر زندگی سجا دی ہے

تُجھ کو بھولنا چاہوں اور شکست کھا جاؤں
کتنی بے وقت راہی قوتِ ارادی ہے

جستجو کے صحرا میں اب کہاں کوئی آنچل
میں نے اپنی چھاؤں بھی دھوپ میں گزار دی ہے



یاد کر کبھی اسے تاج تُو بھی اُس محبت کو
جس نے تیرے مرمر کو چاندنی پلا دی ہے

میرا ساتھ کیا دے گا شیخ بر سرِ محفل
وہ تو چُھپ کے بیچارہ جھومنے کا عادی ہے

دوست سب قَتیل اپنے ٹل گئے رقابت پر
میں نے کوئی دل کی بات جب انھیں سُنا دی ہے

بے تعمیر

میں جب اپنی محبوبہ کے پیار سے ہاتھ کو چومتا ہوں

اُس دن پہروں جھومتا ہوں

اور گماں ہوتا ہے مجھ کو

میری طرح میری محبوبہ

رات گئے سونے سے پہلے

اپنے ہاتھ کے اُس حصے کو بڑے گھنڈ سے چومتی ہوگی

جس کی نذر کیا ہوتا ہے میں نے بوسے کا نذرانہ

یہ نذرانہ اپنی سوچ میں گھول گھول کر



دھڑکن دھڑکن تول تول کر
 ساری رات وہ جھومتی ہوگی
 پاؤں زمیں پہ نہ لگتے ہوں گے
 سوچ کی جنت میں وہ جب جب گھومتی ہوگی۔

اُس کو ناز کہ پُرجے اُس کو
 پاگل پن کی حد تک اُس کا ایک پُجاری
 مجھ کو اطمینان کر میں نے
 اُس کے نام پہ اپنی ساری عمر گزاری

میری عقیدت اور اس کی بے مروتی سدا ہے
 طاری ہے جو ہم دونوں پر
 وہ کیفیت سدا ہے
 سدا ہے وہ خواب جسے تعبیر سے نسبت کوئی نہیں



اے کاش تھے ایسا اک زخمِ جدائی دوں
 جب ٹیس کوئی چکے میں تجھ کو دکھائی دوں

جس روز کبھی تیرا دیدار نہ ہو پائے
 میں اپنی ہی آنکھوں کو نابینا دکھائی دوں

مغزور ہے تو کتنا صرف ایک صنم بن کر
 تو چاہے تو میں تجھ کو تن من کی خدائی دوں

تجھ سا کوئی دل والا محسوس کرے مجھ کو
میں گیت نہیں ایسا جو سب کو سنائی دوں

اک عمر کے بعد اپنے چہرے کو پکڑا ہے
میں کیسے تفتیل اس کو ہاتھوں سے رٹائی دوں



دنیا کو دکھانی ہے اک شکل خبی لوں کی
آؤ کہ بنائیں ہم تصویر اُحب لوں کی

پہل بھر کو مرے گھر میں آئی جو پری اڑ کر
کی اُس نے بسر مجھ میں سورات وصالوں کی

ہم دیتے چلے جائیں کس کس کا جواب آخر
رفار نہیں گھنٹی دُنی کے سوالوں کی

شاعر ہی تو دیتے ہیں تشبیہ گھاؤں سے
ہم قدر بڑھاتے ہیں تم گیسٹوں والوں کی



اسے دوست ادب اپنا پھر کیوں ہو صحت مند
بنتی ہیں مری غزلیں خوراک رسالوں کی

بے چین قتیّل اُن بن ہم ہی تو نہیں تنہا
اُن کو بھی ضرورت ہے ہم چاہنے والوں کی

چاند، بڑھیا اور پتھر

اے طرب خانہ مشرق سے اُبھرتے ہوئے چاند
میں نے بچپن میں سنا تھا کوئی بڑھیا تجھ میں
اُن گنت صدیوں سے بیٹھی ہوئی چرخہ کاتے
اس روایت سے بہت دیر نہ چھوٹا دامن
بن گئی ایک حقیقت یہ ترے ہی ناستے
جب ذرا ہوش سنبھالا تو یہ سوچا میں نے
سُوت کے ڈھیر لگے ہوں گے تری دادی میں
سُوت — وہ جس سے بنا کرتا ہے مفلس کا لباس
ہوگا تقسیم کر ڈروں کی اس آبادی میں

لیکن اے چاند ترے شہر میں جب میں پہنچا
کوئی بڑھیا تھی وہاں اور نہ چرخہ کوئی
سُوت پھر سُوت ہے پانی تھا وہاں اور نہ ہوا
بے جی اڑھ کے سب تیری فضا تھی سوئی

منتظر تھے مری دھرتی کے برہنہ انساں
میں انھیں دوں گا ترے نور کے دھاگے لا کر
وہ بھی شرمندہ ہوئے مجھ کو بھی شرمندہ کیا
میں نے لا پھینکے جب اُن لوگوں کے آگے پتھر

رائیگاں جانہیں سکتا تھا سفند میرا کبھی
چاند پر سُوت کا اک تار بھی گرہل سکتا
یہ ندامت مرے جھٹے میں نہ آئی ہوتی
پتھروں سے کوئی ملبوس اگر بسل سکتا

اے طرب خانہ مشرق سے ابھرتے ہوئے چاند



ان بھرستانے کے لیے پیڑوں سے چمن کرائی
میرے لیے اک تیرگی سورج پہن کر آگئی

میں زندگی کی تلخیاں جب چھوڑ جانے لگا
وہ شکل میرے سامنے دیوار بن کر آگئی

جو کچھ مجھے بخشا گیب کم تھا بہت۔ روزِ ازل
حیرت کہ پھر میری انا کسی طرح من کر آگئی

چاہا کہ شہرِ حسن میں اُدنی مری گردن ہے
میرے مقابل عمر کی شمشیر تین کر آگئی

دورِ خِمتی جس کی زندگی، جس کا کوئی بچہ نہ تھا
شہر کے گھر وہ بے نوا، اک سوت جی کر آگئی

واقف نہیں کیا تُو قسَمِ اس پتھروں کے شرے
کیوں اس میں تیری زندگی سہیشہ پہن کر آگئی



یہاں ظلم بندوں پر جب ہو رہا تھا وہ کیوں چُپ رہا
بُجھے پُچھتا ہے کہ وہ تو خدا تھا وہ کیوں چُپ رہا

فلک تک نہ پہنچا اگر بے نواؤں کا نالہ کوئی
یہیں ایک طوفانِ آب و ہوا تھا وہ کیوں چُپ رہا

جو کمزور تھے اُن میں ہمت نہیں تھی کہ وہ بولتے
مگر روزِ منبر یہ جو چِخت تھا وہ کیوں چُپ رہا

اُسے اپنے جیسوں کی ایک ایک کڑت معلوم تھی
ہمارا جو خود ساختہ رہتا تھا وہ کیوں چُپ رہا



نشانہ تشدد کا جب شہریوں کو بتایا گیا
جو اس شہر میں امن کا دیتا تھا وہ کیوں چُپ رہا

عدالت میں جھوٹے گواہوں کی یلع رتھی کس لیے
جو ہر بات اچھی طرح جانتا تھا وہ کیوں چُپ رہا

سلیمتہ نہیں عام انسان کو بولنے کا مگر
قتیل ایک شاعر ہو شعلہ نوا تھا وہ کیوں چُپ رہا

دوہا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



چلی جو نار ہزار بار، دھنک پر رکھ کر پاؤں
اب کے پیراؤں نار کے، دیکھے بناں کھڑاؤں



مست آئو تم شہر میں، بن بن ناچتے مور
زرت کے دشمن سب یہاں کیا حاکم کیا چور



تجھ بن ہو گئی ساجنا، میں کتنی کنکال
چاندی بن کے رہ گئے سونے جیسے بال



جانے کیونکر سہ گئی، میں برہا کی آنچ
جلی آگ کے سامنے، ثابت رہے نہ کاچ

پلکوں پیچھے جھومتے، راک گوری کے نین
آپ رہیں نبت موج میں، ہمیں کریں بے چین



بھر بھر آہیں دُور سے، گوری کو مت چھیڑ
چلیں نہ جب تک آندھیاں نہیں کھڑتے پڑ



دل کو دل سے تول کے جو کرتے ہیں پریت
قوم قبیہ دیکھنا، نہیں ہے اُن کی ریت



وہ زردلیٰ مزدور تھا، بھلے نہ تھا چنگیز
جس نے سمجھی سے لیا، پہلی بار حمیز

کہہ کے نہ آئے بالما، اُٹھے ہے من میں ہوک
سونا ہے مرا آگنا، کوئلیا مت کوک



کاگا زور سے بولیو، میرے منڈیر سے آج
ساس نغند کے سامنے، رکھو میری لاج



جہاں نہیں من شانتی، جہاں نہیں تن گیان
گھر ہو یا بن باس ہو، دونوں ایک سمان



نستی تو میں ہو جاؤں گی، پر یہ مجھ بت؟
پہلے اگر میں مر گئی، بھلے گا تُو بھی کی؟

رہے کبھی نا ایک سا گھٹنا بڑھتا چاند
پیاد کا ویک سدا جلے پڑے کبھی نا ماند



پت جھڑکے بہار سے، پگلی یہ مست جھول
سدا نہ لہکیں ڈالیاں سدا نہ مکیں پھول



پتھر مارے پیڑ کو، جب کوئی کھیلن مار
رک جائے تب پیڑ پر چڑیوں کی چہکار



جڑا سا ہے ہر آدمی اک دوجے کے سنگ
الگ الگ سب صورتیں، لہو کا ایک ہی رنگ

پورب یکھم دور دورا دن کا ہے نام
ریتا جی سے پوچھے رام ہیں پھر بھی رام



بھرے پڑے سنسار میں، جب بھی ملے کانت
پیاد کے جا پ سے، من کو رکھے شانت



کسی کی ٹوٹیں چوڑیاں، کسی کا بنے سہاگ
کبھی یہ دنیا روگ ہے، کبھی یہ دنیا راگ



ٹکھ پائے یا دکھ سے، مار لے یا جیت
دھرم چکور کا پریت ہے، کرے گا چاند سے پریت

کتے سونے ہو گئے، اپنے چیت بساکھ
بکھی تھے آگ ہی آگ ہم اب ہیں راکھ ہی راکھ



بکھی تولے پر میسور، کر پوری مری آس
میں بھی لکھوں شکستہ بن کر کالی داس



سانچہ ہمارے راج میں، لکھے کوئی قتل
منتر لکھو تم گاڑ دو، اس کے ہاتھ میں کیل



دُوب مرا رک آدمی، آس اُمید سمیت
نکلی جب ہر سید سے، موتیوں بیلے ریت

یوں نینوں کو چین دے، اُس گوری کا روپ
جیسے چیت بساکھ کی، گرم گلابی دُھوپ



اپنے ہی گھر ساٹوری، کاٹ رہی بن باس
رستہ ملن کا روک لیں، کبھی منہ کبھی ساس



سُدر نار چہرہ رک، جس کا باپ اچھوت
چوڑے اُس کے پاؤں کو، پنڈت جی کا پُرت



یہ پیسہ کیا چیز ہے، کھلے نہ اس کا بھید
جب آیا مرے ہاتھ میں، کرنے آیا چھید

سب کی میلی آنکھ ہے سب کے من میں کھوٹ
ساجن میرے پیار کو، چاہیے تیری ادھ



جب چاہے منہ پھیرے دیکھے صبح نہ شام
جیون ہے وہ بیسوا، دغا ہے جس کا کام



کاٹھ کی ہنڈیا بانوڑی کا ہے کرے ضرور
بھسم کرے گی جھوٹ کو، سچ کی آگ ضرور



بروں سے میٹھے بول کی دیکھو کم کم آس
نیم کی یہ نمکولیاں ان میں کہاں مٹھاس

منت بریکار میں بیٹھو، بے گن منش کے پاس
وہ اک پھول کی پکس کا جس میں رنگنہ باس



آئی جھولا جھولنے، گوری پیا کے سنگ
چنری میں لہرا گئے، دھنک کے ساتوں رنگ



اُس نے گھونگھٹ کھول کر کی جب پیار سے بات
اور بھی روشن ہو گئی پھیت کی چاندنی رات



اک پل بھی اب چین سے رہا نہ جائے سانس
پی پن جو بھی سانس نوں بنے گلے کی پھانس

آج نیا اک چٹکلا، ہم نے سنا قتل
کوٹا جھیل کو پی گیا، ہاتھی لے گئی چیل



شہروں میں کیا شہر ہے ہری پور اک شہر
جہاں روپ کی بارشیں برسیں آٹھوں پہر



جب تپتے لاہور میں چڑھے مہینہ چیت
آئیں یاد قتل کو، ہری پور کے کھیت



لندن ہو یا ماسکو، ترکی ہو یا شام
سب سے پیارا ہے مجھے ہری پور کا نام

زرگن کب گنوان تھا، لوگو دیکھتے جب او
لوہا بیچ نہ پائے گا، وہ سونے کے بھاؤ



جب کہیں پورے تول کے، باقی رہنے باٹ
بکری مل کر شیر سے، پانی پیے کس گھاٹ



بو جھو ہم میں کون ہے ایسا پاگل شخص
بڑا لگے جسے آئینہ دیکھ کے اپنا عکس



برسیں کسی پہ بدلیاں لگے کسی گھر آگ
اپنے اپنے لیکھ ہیں اپنے اپنے بھاگ

آپ رہیں سب عیش سے، بھوکے نریں کسان
شالا سدا جیئیں ہرے، ہری پور کے خان



یارب کبھی نہ ماند ہو، میرے شہر کا روپ
بہتر تپتی پھاؤں سے، جس کی ٹھنڈی ٹھوپ



تیری کیا ہے شاعری، کنول ہٹاں اک بھیل
شاعر دہے انگ کا، تو کیوں بنا قلیل



کہیں جسے عبدالرحیم، وہ خانوں کا خان
دوسے لکھ کر بن گیا، کویتا کی پہچان

ماضی میں اس شہر نے، بہت کیا ناشاد
گئی نہ پھر بھی ذہن سے، ہری پور کی یاد



جوڑیں رشتہ پیار کا، ہری پور کے ساتھ
نرگس، جگنو، کوئلیں، تہریں اور باغات



گندم پی مشین کی، کھائے سب لاہور
پن چکن میں جو پے، اُس کا مزا کچھ اور



قریرہ قریرہ جھوٹے، خوبانی کے پیڑ
جانے کون بلاؤں نے، جڑ سے دیے اکھیر

ہم نے اُردو شاعرو، خوب دکھایا کام
میر کی لمبی بحر کا، دو لاکھ دیا نام



کہتے اس کے ماترے، یہی نہ جانے کو
دوہے کی گت دیکھ کے، دیا کبیرا رو

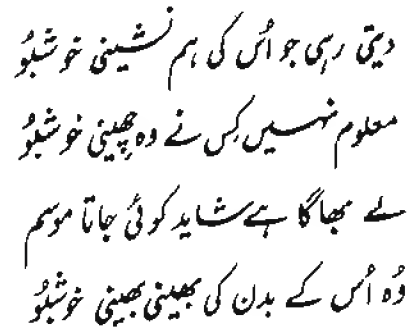
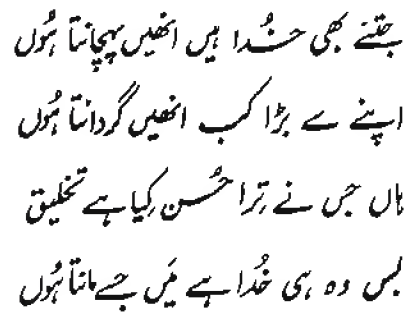
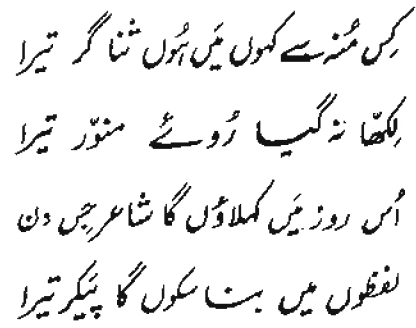


پڑھ لے مرزا صاحبان، غور سے جو اکبار
وہ دوہے کے وزن میں، کبھی نہ کھائے مار



غزل کہو تو میر سی، مجھ سا گیت کہو
دوہے، لکھو کبیر سے، ورنہ چُپ رہو

رباعی





رنگین کٹی، دیکش دمسرد کٹی
تھی زندگی جتنی بھی وہ بھرپور کٹی
بے کیف اگر تھی تو وہی تھی جاناں
جو عمر بری تجھ سے ذرا دور کٹی



جذبات کی اک بزم سجائے مرے ساتھ
ہر سانس میں اک دیپ بجائے مرے ساتھ
شاید کہ میں پھر سوتا رہوں حشر تک
ایک آدھ تو رت جگا منالے مرے ساتھ



جاں موت کے آویزے میں جڑ جاؤں گا
اوروں کی طرح قبر میں گر جاؤں گا
مرنے کا نہیں خوف ذرا بھی مجھ کو
غم یہ ہے کہ میں تجھ سے بھڑ جاؤں گا



دلدار کی مانند نہیلی کی طرح
تو مجھ سے ملے یار، پیسی کی طرح
راک روز کھلے دل سے بغل گیر تو ہو
دکے گا ترا حسن چنبیلی کی طرح



جانم، یہ رسیلی یہ کٹیلی آنکھیں
رہتی ہیں جو بے پیے نشیلی آنکھیں
ایسا نہ ہو آخر یہ ڈلو دیں مجھ کو
یہ تیری سمندروں سی نیلی آنکھیں



دیکھ اپنی اداؤں سے نہ شرمایا کر
ہر محفلِ زرتاب پہ چھا جایا کر
ست رنگا دوپٹہ نہ اگر مل پائے
تو صرف دھنک اوڑھ کے آ جایا کر





تُو آئے تو جنت مرا گھر ہو جائے
یہ عمر سہولت سے بسر ہو جائے
ہم میں تو دلوں کا ہے وہ رشتہ جانناں
تُو روئے تو دامن مرا تر ہو جائے



کچھ لوگ تو مرتے ہیں قضا کے ہاتھوں
کچھ زہرہ جہانوں کی ادا کے ہاتھوں
لیکن مجھ تیرے لیے ڈر ہے یا شیخ!
مر جائے گا تو صبر و رضا کے ہاتھوں



اک رند کو ناراض نہ کر اے ساقی
پھر غم کا آفت زہ نہ کر اے ساقی
بولیں گے ہرے حق میں ترے جام و سہو
مجھ کو نظر انداز نہ کر اے ساقی



کہتے ہیں مے ناب یہ پابندی ہے
واعظ کا ہے فتویٰ کہ بہت گندی ہے
رندوں کی تو واضح سے نہ چوکے پھر بھی
اللہ کی یہ حرام کوئی بندی ہے



اے کاش کچھ ایسا بھی قرینہ آجائے
ساغر کی جگہ آنکھ سے پینا آجائے
ہجرت کریں ہم لوگ جو میخانے سے
رستے میں اُن آنکھوں کا مدرسہ آجائے



دل پر اثر شام دہی ہے کہ جو تھا
جذبات میں کھرام وہی ہے کہ جو تھا
بے رنگی حالات پہ دل کر مرے ساتھ
روتا ہوا اک جام دہی ہے کہ جو تھا





اے حضرت واعظ تری باتوں کے نثار
جن سے یہاں تکفیر کی چھائی ہے بہار
ہو سکتا ہے یہ تیرے سوا کس کا کام ؟
بارانِ فتاویٰ ہے یہاں موسلا دھار



نظرت ہی نہیں فن بھی حسیں ہے میرا
مداح ہر اک ماہ جمیں ہے میرا
واعظ کی بھلا بات میں سہ لوں کیسے
واعظ کوئی معشوق نہیں ہے میرا



تو عقل کے گُر ان کو سکھاتا کیوں ہے
لوگوں میں مہبدم اپنا گنواتا کیوں ہے
چہرہ ہو کسی کا تو نظر آئے عکس
بے چہروں کو آئینہ دکھاتا کیوں ہے



محفوظ پس نقاب تو بھی تو نہیں
کانٹے ہیں جو ہم گلاب ٹو بھی تو نہیں
واعظ ترے اعمال پر سب کی ہے نظر
ناواقفِ احتساب تو بھی تو نہیں



تو صاحبِ اعجاز نہیں ہو سکتا
ٹنچہ پر تو ہمیں ناز نہیں ہو سکتا
کرتا رہے کائیں کائیں کوتاہی گفت
کوئل کا ہم آواز نہیں ہو سکتا



دنیا کی ہر اک شے سے محبت ہے عظیم
واعظ نہیں کر سکتا دلوں کی تقسیم
ستوار چلائے کر چھری سے کاٹے
پانی تو نہیں ہو گا کسی طرح دو نیم





سُکھا ہوا پتہ جو گرگرا ڈالی سے
اک پردہ اٹھا زلیست کی پامانی سے
چھا جاتی ہے جس وقت بہاروں پر غزال
رونے کی صدا آتی ہے ہریالی سے



آفتاب میں جنت کا نشان ہے عورت
غارت گر فردوس کمال ہے عورت
آدم سے کہو، اتن پریشان نہ ہو
جنت وہی دھرتی ہے جہاں ہے عورت



عورت نہ کسی سے بھی یہاں کم ہوتی
شعروں میں گندھی ہوئی وہ شبنم ہوتی
مردوں کے معاشرے نے بڑھنے نہ دیا
ورنہ یہی حکمران عالم ہوتی



ٹوٹی ہوئی بانہی میں وہ بس لیتا ہے
بھوکا ہو تو کچھ روز ترس لیتا ہے
اس پر بھی نہیں سانپ کو ڈستا کوئی سانپ
انساں مگر انسان کو ڈس لیتا ہے



آئندہ نہ آنکھوں سے اٹھاؤں گا غلات
کر دے یہ حط اے مرے اللہ معاف
یہ دیکھ مرے ماتھے پر تازہ اک زخم
بولا ہوں میں فرسودہ رواجوں کے خلاف



کاٹا ہوا تن سے یہ گھر کس کا ہے
ٹوٹا ہوا بیون کا سب کس کا ہے
کچھ تم ہی بست و بستی پیشہ لوگو!
یہ ریل کی پٹری پر لو کس کا ہے





دُہرائی ہے یادوں نے کمانی اُس کی
آنکھوں میں ہے تصویر پُرانی اُس کی
وہ لوگ بتائیں گے قیامت کیا ہے
جن لوگوں نے دیکھی ہے جوانی اُس کی



لمحوں کا نشانہ کبھی ہوتا ہی نہیں
وہ صیدِ زمانہ کبھی ہوتا ہی نہیں
ہر عمر میں دیکھا ہے دکھتا وہ بدن
سونا تو پُرانا کبھی ہوتا ہی نہیں



خود جلوہٴ حُسنِ ازلی ہو جاتا
پستل سے میں سونے کی ڈلی ہو جاتا
گر اُس کی جگہ کرتا پرستش رب کی
میں اپنے زمانے کا ولی ہو جاتا



کچلا ہوا شیطان بلا بھی تو کیا
اپنا اُسے عرفان بلا بھی تو کیا
عورت کے بدن کی دلربائی کھو کر
گو تم کو جو زردان بلا بھی تو کیا



آباد اسی نے دل کی دادی کی ہے
تاریخ نے اکثر یہ منادی کی ہے
عورت کی بڑائی کا یہ کافی ہے ثروت
عورت سے پیمبروں نے شادی کی ہے



نظروں میں دھنک گھولتے دیکھائیں نے
سوچوں کی گرہ کھولتے دیکھائیں نے
وہ میری ہر اک بات پر خاموش رہا
حُسنِ اُس کا مگر بولتے دیکھائیں نے





کب جھوٹے موسم کی فضا میں دے گا
کیا پیار سے اب کوئی صدائیں دے گا
اس جس کے ماحول میں ہم لوگوں کو
داغ کی طرح کون ہوائیں دے گا



خورشید تھا وہ فن کو ضیاء دیتا تھا
ہر تان سے اک دیپ جلا دیتا تھا
کیا سرسوتی اُس سے چھپاتی چہرا؟
وہ سرسوتی سر کو بن دیتا تھا



غنچہ تو گیسٹیم باقی ہے ابھی
اک سلسلہ قدیم باقی ہے ابھی
کچھ کم نہیں فیض کا بچھڑنا، لیکن
صد شکر یہ سدا نیکم باقی ہے ابھی



راجہ رسلو بیدی، استادِ دامن،
خواجہ خورشید نور اور فیض کے لیے
جو ایک کے بعد ایک ہم سے جدا ہو گئے



اُچڑے ہیں دلوں کے باغ باری باری
خالی ہوئے سب ایوان باری باری
تھی روشنی میخانے میں جن کے دم سے
گل ہو گئے وہ چہرا باری باری



ہر چہرہ کہ پہلے بھی پھڑا موت کا راگ
لگتی رہی لفظوں کے محلات میں آگ
جس روز مگر جلی ہے بیدی کی چست
اُس روز تو ٹٹ گیا کافی کا سہاگ





دل سے وہ کبھی دُور نہیں ہوتا ہے
مر جائے تو دھڑکن میں لکے ہوتا ہے
جو شخص حسینوں میں چاہتا ہو تا مرگ
اُس شخص کا مرنا بھی حسین ہوتا ہے



جس سے ہو محبت کوئی کرنے والا
وہ شخص نہیں ہوتا بکھرنے والا
جب کوئی حسین بین کرے لاشے پر
اک بار تو جی اٹھتا ہے مرنے والا

خماسی

برا درگاہی قلیل ثنائی صاحب !

استقامت

ایک بے نام صنف یعنی رباعی پر ایک مصرعے کے اضافے کے ساتھ
آپ نے جو تجربہ کیا ہے وہ بے انتہا کامیاب رہا ہے۔

یہ عرض لکھنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ کی معلومات کے لیے عرض
کروں کہ یہ صنف بے نام نہیں ہے۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ایران میں رباعی پر
اس قسم کے تجربے ہوئے اور وہ اس طرح تھے۔

۱۔ رباعی سے ایک مصرعہ کم کر کے اسے ثلاثی کا نام دے دیا گیا۔ بہار
ہاں لوگ جو ثلاثی لکھتے ہیں وہ اس بے ثلاثی نہیں کہلاتی جاسکتی کہ اس
تجربے کو پہلے ہی ثلاثی کا نام دیا جا چکا ہے چنانچہ ثلاثی تین مصرعوں
کی وہ نظم ہوئی جو رباعی کے وزن پر ہو۔

۲۔ رباعی پر ایک مصرعے کا اضافہ کر کے اسے "خاصی" یا "پنج گز" کا نام
دیا گیا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com



۳۔ رباعی پر دو مصرعوں کے اُٹھانے سے جو صنف ایجاد ہوئی اُسے
”شش گانہ“ کہا گیا۔

۴۔ رباعی پر تین مصرعوں کا اضافہ کیا گیا تو اُسے ”ہفت گانہ“ کہا گیا۔

مجھے خیال آیا کہ آپ کی نظر سے شاید فارسی کی جدید شاعری کی تاریخ اور
خاص کرنے تجربات کی تاریخ نہ گزری ہو اس لیے یہ چند باتیں لکھ رہا ہوں۔ شاید
آپ اس صنف کو ”خاصی“ کا نام دینا پسند فرمائیں جو نہایت مناسب ہو گا اس لیے
کر ثنائی اور خاصی رباعی ہی کے درجہ پر ہیں۔

نیا زمند :

ڈاکٹر ایاس عشقی

محترم عشقی صاحب !

سلام شوق

یہ درست ہے کہ جدید فارسی کے نئے تجربات کی تاریخ میری نظر سے نہیں
گزری اس لیے — ۱۔ ”آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے“ — آپ
سے پہلے بھی چند احباب نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں اس صنفِ سخن کو ”خاصی“ کے نام
سے پیش کیا کروں۔ اب آپ کا بھی یہی مشورہ ہے تو جیسے ”درست“ ”خاصی“ ہی کے
عنوان سے بے نام سخن پارے حاضر ہیں۔ لیکن مجھے اتنا اور بتا دیجیے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد
اڑسٹھ برس کے عرصے میں کبھی اُردو شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے ؟

مخلص ،

فتیس شفاء



ہٹ جائیں نہ دُنیا سے کہیں حُسن و جمال
صحرائے بدن پر برس اے ابر وصال
اس بات کا اب تک نہیں کیا تجھ کو خیال
جس دشت میں پیاسا کوئی مرجھاتا ہے
اس دشت میں چلتی ہی نہیں بادِ شمال



مذہب تھا مگر جنوں کا دھندا ہی تھا
حق گوئی کا کار و بار مسند ہی تھا
کیا شے تھا عقیدہ ایک پھندا ہی تھا
دی جس کو انا الحق کی سزا دُنیا نے
وہ بھی تو خدا کا نیک بندہ ہی تھا





پینے کا جب ایستام کرتا ہوں میں
سب کے لیے اذن عام کرتا ہوں میں
ہر شام یہ نیک کام کرتا ہوں میں
پر زہد کی اُتری نہ ترے رخ سے نقاب
اے شیخ تجھے سلام کرتا ہوں میں



حالات کو سازگار کرتے کرتے
ماحول کو خوش گوار کرتے کرتے
سامان وصالِ یار کرتے کرتے
پتھرا سی گئی ہیں بری آنکھیں لوگو
اک شخص کا انتظار کرتے کرتے



راتیں تھیں حسین دن تھے سہانے لوگو
یہ بات کوئی مانے نہ مانے لوگو
تم نے تو سنے سارے فسانے لوگو
تم جانتے ہو کیا تھی جوانی اُس کی
اُس شہرِ طرب کے اے پُرانے لوگو



جذبات کی رو میں نہ اگر بہہ جاتے
ہم کانپے کو اک پھول اُسے کہہ جاتے
بہتر تھا کہ دُور اُس سے کہیں ہ جاتے
کچھ زہر سے کم نہیں اب اُس پھول کی باں
کانٹے کی چھن ہوتی تو ہم سہہ جاتے





نظرت کا حسیں طعم تم بھی دیکھو
 ہرکا ہوا اُس کا جسم تم بھی دیکھو
 خوشبو کا بھسم راسم تم بھی دیکھو
 جو پھول جوانی کی حرارت سے کھلیں
 اُن پھولوں کی خام قسم تم بھی دیکھو



اُس بُت سے جو رسم وراہ کرتا ہوں میں
 سب لوگ کہیں گستاہ کرتا ہوں میں
 اس بات پر جب نگاہ کرتا ہوں میں
 دل کہتا ہے دلبروں سے کیسے نہ ہوں
 واعظ سے بھی جب زباہ کرتا ہوں میں



سوچا تھا وہ خوش جمال آجائے گا
 اُس کو مرا جب خیال آجائے گا
 پیغم شب وصال آجائے گا
 درویش تھامیں یہ نہ خبر تھی کہ اُسے
 شاہوں کی طرح جلال آجائے گا



بانہوں کے سبھی سنگار بھولوں جیسے
 یہ رقص کے انداز بگولوں جیسے
 ریشم سا بدن گال میں پھولوں جیسے
 اُس جانِ عزیز کے ہیں غم و غل غمیں
 موزونی شر کے اصولوں جیسے





جذبات کو بے قرار دیکھائیں نے
احساس کو اشکبار دیکھائیں نے
نظروں کا یہ حال زار دیکھائیں نے
اپنا ہی نظر آیا وہ مرستہ مجھ کو
جس شہر میں جو مزار دیکھائیں نے



رُودادِ شکستِ ذات پوری کر لوں
گھٹتی بڑھتی حیات پوری کر لوں
باقی ہے ذرا ہی بات پوری کر لوں
واعظ، ترا فرمان سر آنکھوں پہ، مگر
پہلے یہ گزرتی راست پوری کر لوں



ہم وہ ہیں جنہیں زندگی پہچانتی ہے
اک راہنما وہ ہمیں گردانتی ہے
ہم جھوٹ بھی کہہ دیں تو وہ سچ جانتی ہے
یہ سب ہے حقیقت تو بتا اے دُنیا
تُو بھی کسی عاشق کو ولی مانتی ہے؟



تھا مجھ پہ چکنے کو اک ایسا غور شہید
ہونی تھی نئے وصل کی جس سے تہسید
پوری نہ ہوئی میرے لیے جب یہ نوید
دریافت کیا میں نے تو معلوم ہوا
حالات نے کر دیا محبت کو شہید





بکلی میں پُرافشاں ہے اُجالا اس کا
 بادل نظر آتا ہے دوشالا اس کا
 پھر اس پر غضب ہے قد بالا اس کا
 چھڑ جائے کہیں ذکرِ قیامت تو قلیل
 دیتے ہیں دیاں لوگ حوالا اس کا



اُس شخص کے پیرہن کی باتیں کر کے
 رنگینی و بانگپن کی باتیں کر کے
 مہکے ہوئے اک بدن کی باتیں کر کے
 گھٹا نظر آتا ہے غمِ زلیست کا بوجھ
 اُس راحت جان و تن کی باتیں کر کے



اُجھا ہوں تری زُلفت کے بل میں جاناں
 رقصاں ہے تُو ہی میری غزل میں جاناں
 زنت رہنا اسی رنگِ مل میں جاناں
 جس دن سے ہوا تُو مری سوچوں میں شریک
 صدیوں کا سفر طے ہوا پل میں جاناں



ساون کی جھڑی گیت سناتی آئی
 ماحول کو رنگین بناتی آئی
 جو بوند بھی آئی گلستاں آئی
 آواز مجھے دی جو کسی بادل نے
 توبہ میری حجام کھنکھاتی آئی





اپنے ہی نشے میں چور آنکھیں اس کی
 بنجیدہ و پُر عسہ در آنکھیں اس کی
 میرے لیے نور نور آنکھیں اس کی
 تابندہ ستاروں سے فلک پر جا کر
 ملتی ہیں کہیں مزدور آنکھیں اس کی



وعدے کی بس ایک شام باقی ہے ابھی
 ماں وصل کا اہتمام باقی ہے ابھی
 اک قرض میرا اُس کے نام باقی ہے ابھی
 میخانے کے میخانے لٹکھائے لیکن
 اُس جسم کا ایک جام باقی ہے ابھی

رفتگال

مولانا صلاح الدین احمد
 فیض احمد فیض
 ساحر لدھیانوی
 شکر تونسوی
 اکبر لاہوری

مولانا صلاح الدین احمد

یاد پھر آئی ہے اُس کی لے دل
جس نے بخشی تجھے پہلی دھڑکن
جس نے چنکائے گھنے ستارے
جس نے پہنائی لہو کو جھانجھن

جس کا سایہ یہ چمکتی ہوئی رت
جس کا پر تو یہ ترنم، یہ ہمار
جس کے ہمراہی صبا کے جھونکے
جس کا ہم رقص بہاروں کا وقار

ہر قدم جس کا نشان منزل
یاد پھر آئی ہے اُس کی لے دل

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سپنوں کا بنجارہ — فیض

وہ ایک ایسا شخص تھا
 جس کے لیے
 بس ایک رائے سب کی تھی
 ”پیارا — بہت پیارا ہے وہ
 سپنے سہانے پیار کے
 بانٹے جو گاؤں گاؤں میں
 ایک ایسا بنجارہ ہے وہ“

وہ کہ مر کر بھی امر ہے یارو
 ہم اُسے یاد کیے حبائیں گے
 ہم بھلائیں گے تو قرطاس و قلم
 اُس کی عظمت کی قسم کھائیں گے

وہ افق پار کسی وادی سے
 ہم کو آواز دیے جائے گا
 آسمانوں کا وہ ہمسرا ہم کو
 ذوقِ پرواز دیے جائے گا

کل بھی جو ہم میں رہے گا شامل
 یاد پھر آئی ہے اس کی لے دل

وہ نغمہ خواں تھا پیار کا
 وہ عشق کا ہم رقص تھا
 وہ تنگدل داعظ نہ تھا
 اُس میں یہی راک نقص تھا
 کہتے رہے اُس کو بُرا ذیر و حرم
 لیکن یہ رائے سب کی تھی اُس کے لیے
 ”پیارا — بہت پیارا ہے وہ
 سپنوں کا بنجارہ ہے وہ —“

”ساری زمیں جس کا وطن
 سارا جہاں جس کا مکاں
 سب لوگ جس کے ہم سخن
 سب لوگ جس کے ہم زباں
 جس نے تراشیں مسند لیں
 جس نے بنائے کارواں
 چل کر دلوں کی راہ سے
 چھو لی ہے جس نے لکھناں“

”وہ روشنی کی کھوج میں
 چلتا رہا — چلتا رہا
 چہرے پر وہ گردِ سحر
 نکلتا رہا — نکلتا رہا
 وہ آنندھیوں کے درمیاں
 جلتا رہا — جلتا رہا
 وہ زندگی کے حُسن میں
 ڈھلتا رہا — ڈھلتا رہا“

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساقی کے لیے

یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

وہ اک بیمارِ غم جو زندگی بھر کم سے کم سویا

نہ وہ جی بھر کے خود سویا نہ کوئی اُس کا غم سویا

جو سویا بھی تو گویا دد گھڑی لینے کو دم سویا

مگر اب کے وہ اپنے درد کی کھا کر قسم سویا

کبھی پہلے نہیں تھی بے قراری جو اسے اب تھی

یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

اسے معلوم تھا اس کا ٹوٹے سرد ہونے کو

کھلا تھا اس کا چہرہ آج کی شب زرد ہونے کو

دُوا تھی منتظر اس کی سراپا درد ہونے کو

نہ وہ خاطر میں لایا حسرتوں کے گرد ہونے کو

بھلا حسرت کوئی اس ناتواں پر مہرباں کب تھی

یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

جو باقی مئے تھی اس کی زندگی کے آب گینے میں

وہ مئے اُس نے ملا دی موت کے ٹھنڈے پسینے میں

پھر اس کے بعد جا بیٹھا وہ اک ٹوٹے سینے میں

اُترنا تھا اُسے دریا کے ناہموار سینے میں

وہ دریا چند برسوں سے روانی جس کی بڑھب تھی

یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

غزالاں خوب واقعت ہیں کہ ماتم ہو رہا ہوگا

دوانہ مرگیا، ویرانہ اُس کو رو رہا ہوگا

وہ خود ہی جانتا تھا جو بھی غم اُس کو رہا ہوگا

مگر اب پھین سے اپنی حسد میں سو رہا ہوگا

سنا ہے جب وہ سویا مسکرا ہٹ زینت لب تھی

یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

دے سکا نہ چین اپنے جسم کو
اُن گنت دلوں کا جو طیب تھا

رو رہے تھے اس کو شیخ و بدہمن
مر کے بھی وہ کتنا خوش نصیب تھا

اُس کو بھی تھا عشق ساری خلقت سے
یوں قتیل وہ مرا رقیب تھا

فکر تو نسوی

فکر تو نسوی مرا حبیب تھا
میری جان سے بھی وہ قریب تھا

جس چمن میں اشتراک غار و گل
وہ اُسی چمن کا عشقِ طیب تھا

بیر اُس کو تھا سیاہ رات سے
اک نئی محراب کا وہ نقیب تھا

پیار کے جواہر اس کی ملکیت
یہ ہے سب غلط کہ وہ غریب تھا

محسوس یہ ہوتا ہے
 وہ ناپتے لفظوں کا
 بے چین سمندر تھا
 وہ مست قلندر تھا
 نغمات کی خوشبو سے
 مہکائے چمن اُس نے
 جذبات کی جدت سے
 گرمائے بدن اُس نے
 لمحات کو صدیوں کے
 پہنائے برن اُس نے
 تھا شوخ بہت لیکن
 جو لفظ بھی تھا اُس کا
 آداب کے اندر تھا
 وہ مست قلندر تھا
 آتی تھی نظر اُس کے
 جذبات کی شادابی

اکبر لاہوری

وہ مست قلندر تھا —

وہ رونق ہر محفل
 وہ پیار کا شیدائی
 کرتا تھا محبت سے
 یابروں کی پذیرائی
 یاد آتی ہے جب اُس کی
 وہ انجمن سے آرائی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹھوٹی ہوا اندھیرے میں
جیسے کوئی مستابی
اک آنکھ جو اُردو تھی
اک آنکھ تھی پنجابی
یارو یہ حقیقت ہے
اس ملکِ منور میں

وہ فن کا سکندر تھا
وہ مستِ قلندر تھا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

